محرم الحرام ۱۴۴۷ھ
جولائی ۲۰۲۵ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- درس سورۃ الفاتحہ (مسلسل)
- یہود، قرآن اور ہم

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر

بیانُ القرآن

ترجمہ مع منتخب حواشی

❁ امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ دیدہ زیب مضبوط جلد ❁ 1248 صفحات

~~-/4500~~ روپے کے بجائے
صرف -/2200 روپے میں

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

رمضان پیکج کے تسلسل میں

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

’’اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!‘‘

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد	:	74
شمارہ	:	7
محرم الحرام		1447ھ
جولائی		2025ء
فی شمارہ	:	50روپے
سالانہ زرِتعاون	:	500روپے

مُدیر مسئول

شجاع الدّین شیخ

مُدیر اعزازی

حافظ عاکف سعید

مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت

○ رضاء الحق ○ ایوب بیگ مرزا

○ خورشید انجم ○ وسیم احمد

معاون مدیران

○ محمد خلیق ○ حافظ محمد زاہد

مکتبہ خُدّامُ القرآن لاہور، 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700

فون: 3-35869501 (042)، 0341-4941212

ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321

publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ’’دارُالاسلام‘‘ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال —— 5

ماہِ جون .... رضاء الحق

تذکرہ و تبصرہ —— 10

ہوئے تم دوست جس کے .... شجاع الدین شیخ

درسِ قرآن —— 13

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ (۳) ڈاکٹر اسرار احمدؒ

فِیْهِ ذِکْرُکُمْ —— 35

یہود‘ قرآن اور ہم ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دین و سیاست —— 51

اسلام کا سیاسی نظام ایوب بیگ مرزا

حقیقتِ دین —— 55

اَسماءُ اللہ الحُسنٰی پروفیسر حافظ قاسم رضوان

تعمیرِ سیرت —— 65

کامیاب لوگوں کی چار عادات طارق سہیل مرزا

تعلیم و تعلّم —— 73

حصولِ علم کا ذریعہ: مطالعہ احمد علی محمودی

حسنِ معاشرت —— 79

بدگمانی اور تجسّس حافظ محمد اسد

’’ادارہ‘‘ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ماہِ جون......

جون کا مہینہ پاکستان کی عوام کے لیے سال کا خوف ناک ترین مہینہ ہوتا ہے جو الحمدللہ گزر چکا ہے۔ بہر حال یہ مہینہ حکمرانوں اور محصولات جمع کرنے والوں کے لیے بڑے بڑے اہداف حاصل کرنے کے بعد کامیابیاں لیے آتا ہے۔ جو افسر یا اہل کار جتنا بڑا ٹارگٹ حاصل کرتا ہے' اُسے اُتنا ہی بڑا انعام بھی ملتا ہے۔ عوام الناس کو ٹیکس نیٹ میں لانے کے لیے اداروں کے علاوہ اب عام لوگ بھی سرگرم عمل ہو چکے ہیں۔ اگر آپ سیل فون استعمال کرتے ہیں تو یقیناً آپ بھی اِس بات کی گواہی دیں گے کہ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ کسی نئے نمبر سے آپ کو موصول ہونے والی کال یا ایس ایم ایس کے ذریعے این ٹی این نمبر حاصل کرنے کی دعوت ملتی رہتی ہے۔ ایسے لوگوں اور اداروں کی محنت رائیگاں ہرگز نہیں جاتی بلکہ ہر روز ہزاروں نئے افراد ٹیکس نیٹ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُن کی اِس محنت کو مدنظر رکھتے ہوئے عام آدمی یہ توقع کر رہا ہوتا ہے کہ اب تو ملک کے حالات ضرور بدل جائیں گے اور ملک میں ہر طرف دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی' مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ قومی اسمبلی کے اجلاس میں وفاقی بجٹ پیش کرنے پر عوام کو معلوم ہوا ہے کہ ۱۷۵ کھرب سے زائد کے وفاقی بجٹ میں تنخواہوں میں ۱۰ اور پنشن میں ۷ فیصد اضافہ کیا گیا ہے جبکہ انکم ٹیکس میں کمی کی تجویز بھی دی گئی ہے۔ بجٹ کے کُل حجم میں سے ۸۲۰۷ ارب روپے صرف اور صرف سود کی ادائیگی پر خرچ ہوں گے جبکہ سود سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ٹیکس کی شرح بڑھا دی گئی ہے۔ دفاعی بجٹ میں ۲۰ فیصد اضافہ کر کے اس کا حجم ۲۵۵۰ ارب روپے کر دیا گیا ہے۔ آن لائن خریداری اور سولر پینلز پر ۱۸ فیصد ٹیکس عائد کر دیا گیا ہے۔

اپوزیشن کا خیال ہے کہ بجٹ ۲۶-۲۰۲۵ء صرف آئی ایم ایف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بنایا گیا ہے جس میں عام آدمی کے نام پر اشرافیہ کو نوازا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی اسمبلی میں بجٹ پیش کرنے سے چند دن پہلے ہی اراکین اسمبلی' وزراء' اور اسپیکر وغیرہ کی

تنخواہوں اور مراعات میں پانچ گنا تک اضافہ کیا گیا حالانکہ اُنہیں اِس اضافے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بتایا گیا ہے کہ اراکین اسمبلی پارلیمنٹ ہاؤس کے کیفے ٹیریا سے کھانا کھا کر جتنا بل (ادھار یا نقد) ادا کرتے ہیں‘ اُس رقم سے دس گنا زیادہ رقم عام آدمی کسی ریستوران میں کھانا کھا کر ویٹر کو ٹِپ دے دیتا ہے۔ اِس بات میں تو مبالغہ ہو سکتا ہے مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ عوام پر تو ٹیکسوں پر ٹیکس لاد دیے جائیں اور اُنہیں کوئی ریلیف بھی نہ دیا جائے جبکہ عوام کی نمائندگی کرنے والوں کو ہر طرح کا ریلیف بھی مل جائے‘ اُن کی تنخواہوں اور مراعات میں پچھلی تاریخ (back date) سے اضافے بھی کر دیے جائیں اور پھر پراپیگنڈا یہ کیا جائے کہ بجٹ میں عام آدمی کو بڑا ریلیف دیا گیا ہے۔

حالیہ بجٹ میں یوں تو عوام میں سے ہر کسی نے ہی بڑھ چڑھ کر اپنے خون پسینے کی کمائی سے قربانی دی ہے‘ مگر وہ خواتین جن کی بیوگی کو دس سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا ہے‘ ان کی قربانی بہت بڑی ہے کیونکہ اب وہ فیملی پنشن لینے کی حق دار نہیں رہی ہیں۔ پیٹرولیم مصنوعات پر ڈھائی روپے فی لیٹر کاربن لیوی عائد کرنے کا اعلان کر کے ان کی قیمتیں ایک مرتبہ پھر اُسی سطح پر آ گئی ہیں جہاں کچھ ماہ پہلے چند روپے کمی کر کے مہنگائی میں کمی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا۔ بجٹ میں نان فائلرز کی جس بری طرح سے حوصلہ شکنی کی گئی ہے‘ شاید ہی کسی اور معاشرے میں کی گئی ہو اور وہ اس بات پر سخت پریشان ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں لاکھوں روپے سالانہ ٹیکس ادا کرنے والوں کو بھی مکمل پروٹوکول نہیں مل رہا تو نان فائلرز کو کون اور کیوں پوچھے!

قومی اسمبلی میں بجٹ پیش کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سینٹ میں بجٹ پیش کیا گیا تو وہاں بھی اپوزیشن نے احتجاج کیا۔ اپوزیشن ہو یا عوام‘ ان کے احتجاج کو حکمران جماعت ایک رسم سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی اور کرتی وہی ہے جس کا اُنہیں حکم ملا ہوتا ہے۔ عوام اور حزبِ اختلاف کے احتجاجوں میں اگر کچھ اثر ہوتا تو یقیناً آج ملک وقوم کے حالات ایسے نہ ہوتے کہ سٹیٹ بنک کا گورنر پاکستان میں کسی بھی ادارے یا شخصیت کو جواب دہ ہی نہ ہو۔ حکومت اپنے اللوں تللّوں کے لیے فنڈز اکٹھے کرنے کے لیے عوام کو یہ تو بتاتی ہے کہ اُن پر آئی ایم ایف کی طرف سے بہت دباؤ ہے مگر اُسی عوام کے سامنے وہ اشرافیہ کی تنخواہوں اور مراعات میں اضافے کا بل بھی متفقہ طور پر منظور کرا لیتی ہے... جیسے ان کو مراعات نہیں ملیں گی تو آئی ایم ایف والے

ناراض ہو کر چلے جائیں گے۔ آئی ایم ایف سے قرض ملنے پر حکومتی سطح پر جس طرح سے خوشیاں منائی جاتی ہیں حقیقت میں تو یہ انتہائی شرم ناک بات ہے۔ گویا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن!

گزشتہ کم و بیش نصف صدی سے ہمارا حال یہی ہے۔ ستر کی دہائی میں پیدا ہونے والی نسل کی تو ساری زندگی اسی آس میں گزر گئی ہے کہ قرض کی پی جانے والی مے کسی نہ کسی دن ضرور رنگ لائے گی۔ اِس دوران میں سونیا گاندھی برملا یہ کہہ چکی تھیں کہ ہم نے پاکستانی قوم کو ذہنی طور پر غلام بنا لیا ہے مگر ہم پھر بھی مُصر ہیں کہ ہم نے ۱۹۷۱ء کی جنگ کا بدلہ لے لیا ہے۔ بے شک ع ’’دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے!‘‘ مگر جناب اِس سے دل پاکستانیوں کے نہیں، کسی اور کے خوش ہوتے ہیں۔ مہربانی فرما کر کوئی ایسا کام بھی کر جائیں کہ جس سے پاکستانیوں کے دل بھی خوش ہو جائیں!

بجٹ پیش کرنے سے پہلے ہی منصوبہ بندی کے وفاقی وزیر نے قوم سے پیشگی معذرت کر لی تھی کہ آئندہ مالی سال کے وفاقی ترقیاتی بجٹ میں ۱۰۰ ارب روپے کی کٹوتی کی جا رہی ہے اور ایک ہزار ارب روپے کے ۱۱۸ ترقیاتی منصوبے ختم کیے جا رہے ہیں۔ محدود وسائل کے باعث صرف انتہائی اہم اور قومی مفاد کے حامل منصوبوں کو ہی شامل کیا جا رہا ہے۔

ٹیکسوں پر ٹیکس ادا کر کے اور ہر طرح کی ذلت اُٹھا کر بھی اگر عوام کو یہ جملہ سننے کو ملنا ہے کہ ’’ہم معذرت خواہ ہیں‘‘ تو پھر عوام برے حالات میں کس سے مدد چاہیں گے؟ یقیناً اس سوال کا جواب بھی حکمرانوں نے کچھ سوچ ہی رکھا ہوگا۔ بجٹ سے پہلے جب عوام کو یہ بتایا گیا کہ اگلے مالی سال کے بجٹ میں سے محصولات کا پچاس فیصد سے زائد حصّہ قرضوں کی ادائیگی میں خرچ کیا جائے گا تو سادہ عوام یہ سمجھ بیٹھے کہ اِس کے بعد قرض آدھا رہ جائے گا۔ اِن سادہ عوام کو کسی نے یہ بتانا گوارا نہیں کیا کہ بجٹ ۲۰۲۵-۲۶ء کے کُل حجم میں سے نصف سے زیادہ رقم ماضی قریب و دور میں حاصل کیے گئے قرضوں کا سود ادا کرنے میں چلا جائے گا جبکہ اصل سود تو وہیں کا وہیں موجود ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سود کی مد میں ہم جتنی ادائیگیاں کر چکے ہیں وہ اصل قرض سے کہیں زیادہ ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ سودی قرضوں‘ اشرافیہ کی کرپشن‘ ٹیکسوں کی بھرمار اور آئی ایم ایف کی غلامی نے ملکی معیشت کو تباہ و برباد کر دیا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ بجٹ سے پہلے وزیر خزانہ کی جانب سے پیش کردہ قومی اقتصادی سروے برائے مالی سال ۲۰۲۴-۲۵ء نے ہی یہ ثابت کر دیا تھا کہ حکومت نہ صرف اکثر معاشی اہداف حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے بلکہ گزشتہ مالی سال کے دوران اشرافیہ کو جس طرح سے نوازا گیا ہے ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

افسوس تو یہ ہے کہ آبادی کے لحاظ سے دنیا کے پانچویں بڑے ملک کی شرح نمو صرف ۲ء۷ فیصد رہی۔ پھر حالیہ پیش کیا گیا بجٹ بھی اشرافیہ کا ہی بجٹ ہے جس میں مہنگائی کے پہاڑ تلے پسی ہوئی عوام پر ۵۰۰ ارب روپے کے اضافی ٹیکس لاد دیے گئے ہیں۔ دوسری طرف ۶ لاکھ سے ۱۲ لاکھ تنخواہ پر ٹیکس ۵ فیصد سے کم کر کے ایک فیصد اور ایک کروڑ سے زائد آمدن پر سرچارج بھی کم کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں وفاقی کابینہ کے اخراجات اور وفاقی وزراء‘ وزرائے مملکت‘ سینیٹرز‘ مشیروں اور معاونین کی تنخواہوں میں ہوش رُبا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مہنگائی کو کم کرنے یا دکھانے کے لیے جو حربے استعمال کیے جا رہے ہیں اُن سے مہنگائی حقیقت میں کم نہیں ہوتی بلکہ مزید بڑھتی ہے۔ حکومت اگر حقیقت میں عوام کی فلاح کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے تو فیڈرل شریعت کورٹ کے سود کے خلاف فیصلہ پر فوری اور مکمل عمل درآمد کرے۔ یہی ایک ’’مشکل‘‘ کام ہے جسے انجام دے کر نا صرف تمام مشکل کاموں سے نجات مل سکتی ہے بلکہ عوام کے دل بھی صحیح معنوں میں جیتے جا سکتے ہیں۔

❁❁❁

اب ذرا اسرائیل اور یہود کے عزائم کا بھی مختصر اعادہ کر لیں۔ یہود کے نزدیک مسیح علیہ السلام کی سیٹ ابھی خالی ہے کیونکہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ شیطان نے انہیں ایسی پٹی پڑھائی کہ ان کی مذہبی کتب میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہوئی ہے کہ ارضِ مقدس یعنی فلسطین کا علاقہ یہود کی میراث ہے اور ۱۹۱۷ء کے بالفور ڈیکلریشن کے بعد ناجائز صہیونی ریاست اسرائیل قائم ہونے تک یہودی دنیا بھر سے مقبوضہ فلسطین میں بستے چلے گئے‘ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ان کے مطابق مسیح [جسے وہ مشائکھ (Mashiach) کہتے ہیں اور ہمارے نزدیک یہی مسیح الدجال ہوگا] کے خروج کے لیے ایک بہت بڑی عالمی جنگ کا ہونا

ناگزیر ہے۔ یہ جنگ جو کہ عیسائی مذہبی لٹریچر میں آرمگیڈون (Armageddon) کہلاتی ہے اوراحادیثِ مبارکہ میں اس کا تذکرہ المَلحَمۃ العُظمٰی اور المَلحَمۃ الکُبریٰ کےطور پر آیا ہے' اس کے ذریعے اسرائیل اپنی سرحدیں وسیع کر کے گریٹر اسرائیل قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس گریٹر اسرائیل کو دنیا بھر کے فیصلے کرنے کا اختیار ہوگا۔ یہود مسجدِ اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ بلکہ پورے ٹیمپل ماؤنٹ کوایک مرتبہ چٹیل میدان بنائیں گےاور پھر وہاں اپنی اس عبادت گاہ کوتعمیر کریں گے جسے وہ تھرڈ ٹیمپل کہتے ہیں۔ وہاں تختِ داؤدی لاکرنصب کیا جائے گا' جس پر بٹھا کر دجّال (جوان کےنزدیک ''مسیح'' ہوگا) کی تاج پوشی کی جائے گی' دجّال کی عالمی حکومت قائم ہوگی اور یوں یہودیوں کا ''سنہری دور'' شروع ہو جائے گا۔ یہاں انتہائی اہم بات سمجھنے کی یہ ہے کہ معین شخص دجّال سیکولر/لبرل صورت میں ظاہر نہیں ہوگا بلکہ مسیح ابن مریمؑ ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرے گا۔لہٰذا المسیح الدجّال ایک مذہبی شخصیت کا روپ دھارے گا۔وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے ایسی شعبدہ بازیاں کرے گا کہ دنیا کی عظیم اکثریت اس بات کی قائل ہوجائے گی کہ یہی اصل مسیح ہے (معاذ اللہ)۔ حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا کہ دنیا کے آغاز سے تاقیامِ قیامت انسانیت کے لیے یہ سب سے بڑا فتنہ ہوگا۔اللہ تعالیٰ ہمیں فتنہ دجال سے محفوظ فرمائے۔آمین! جن جنگوں کا آغاز ہو چکا ہےاس میں پاکستان کوابھی مزید گھسیٹا جائے گا۔ہمیں اسرائیل کو ہدف بنانا ہوگا۔لہٰذا دین کودانتوں سے پکڑ لیں اوراپنی تمام توانائیاں ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃِ ثانیہ کو برپا کرنے میں صرف کردیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں اور مقتدرحلقوں کو اس اہم ترین دینی ذمہ داری کوادا کرنے میں مقدّمۃ الجیش بننے کی توفیق عطافرمائے۔آمین!

ماھنامہ ''میثاق'' لاھور

داعیٔ قرآن ڈاکٹراسراراحمدؒ کےقرآنی فکر کا ترجمان' ایک علمی' دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اورحالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین' تعلیمی اداروں' لائبریریوں' مکتبہ جات اور ہر گھر وفرد اور خاص طور پرالاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست' احباب اور اعزہ واقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردارادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

ہوئے تم دوست جس کے .....

شجاع الدین شیخ ‘ امیر تنظیم اسلامی

بھارت کی چھیڑی ہوئی جنگ گزشتہ دنوں امریکی صدر ٹرمپ کے اشارے پر رک گئی تو جہاں پاکستان میں اِس پر خوشیاں منائی گئیں‘ وہاں بھارت میں اِس پر سوگ منایا گیا۔ اِس میں شک نہیں ہے کہ اگر یہ جنگ جاری رہتی تو بھارت کو ناقابلِ تلافی نقصان اُٹھانا پڑتا۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ بندی یا سیز فائر ہونے کے باوجود بھی بھارت پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کوئی ایک موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دے رہا۔ اِس جارحیت کا کریڈٹ کس کو جائے گا‘ بہرحال ایک جواب طلب موضوع ہے۔ دوسری طرف امریکی صدر نے پاکستان کو مسئلہ کشمیر پر ثالثی کی پیشکش بھی کی ہے اور پاکستانی قیادت کو معاملہ فہمی کے اعتبار سے مضبوط قرار دیا ہے۔ اُدھر امریکا اور یورپ کا دورہ کرنے والے پاکستانی سفارتی مشن کے سربراہ بلاول بھٹو زرداری نے بھی صدر ٹرمپ سے کہا ہے کہ وہ جنگ بندی کے عمل کو مستقل شکل دینے‘ کشمیر سمیت تمام معاملات پر بامعنی مذاکرات کے لیے مودی حکومت کو میز پر لانے میں اپنا فعال کردار ادا کریں۔

پاکستانی سفارتی مشن کی امریکی حکام اور کانگرس کے ارکان سے ملاقاتوں کو بھی خوش آئند کہا جا رہا ہے۔ اسی امریکا نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں غزہ میں فوری‘ غیر مشروط اور مستقل جنگ بندی اور انسانی امداد کی بلا رکاوٹ فراہمی کے مطالبے پر مبنی قرارداد کو ویٹو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بطور سپر پاور امریکا کا منافقانہ کردار کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ ادھر امریکی صدر کا پاکستانی قیادت پر اعتبار کرنا یقیناً اِس بات کی دلیل ہے کہ یہ قیادت امریکی صدر کی ہاں میں ہاں اور ناں میں ناں ملانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

ایک پاکستانی ہونے کے ناتے اِس خطے میں امن ہونا یقیناً ہمیں بہت اچھا لگ رہا ہے‘ البتہ اپنی اس خوشی میں اہلِ غزہ کے کرب کو فراموش کر دینا درست نہ ہوگا‘ کیونکہ صحیح بخاری

اور صحیح مسلم میں حدیث مبارک ہے کہ مومنوں کی مثال ایک جسم کی مانند ہے کہ جب اس کا کوئی ایک عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو اُس کا پورا جسم اس کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا رہتا ہے۔ ایسے میں اگر غزہ سے باہر کے مسلمان اہلِ غزہ کی تکلیف کو محسوس نہیں کرتے تو ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ کیا ہم مسلمان ہیں! ۱۰ ممالک کی جانب سے پیش کی گئی اِس قرارداد میں اسرائیل اور حماس کے درمیان جاری جنگ کے فوری خاتمے اور انسانی امداد کی فراہمی کو یقینی بنانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۱۵ رکنی کونسل کے ۱۴ ارکان نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیا مگر امریکا کے ویٹو نے اِسے منظور ہونے سے روک دیا۔ ووٹنگ سے قبل اقوام متحدہ میں امریکا کی قائم مقام سفیر ڈوروتھی شیا نے کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امریکا کسی ایسی قرارداد کی حمایت نہیں کر سکتا جو حماس کی مذمت نہ کرے اور اُس کے غیر مسلح ہو کر غزہ سے انخلا کا مطالبہ نہ کرے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اسرائیل کی سلامتی کو نقصان پہنچانے والی کسی بھی چیز کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ پاک بھارت جنگ رکوانے سے پہلے صدر ٹرمپ نے یوکرین کے صدر کو بھی جنگ بند کرنے کے لیے کہا تھا اور یہ بیان دیا تھا کہ اب امریکا یوکرین کی مزید سرپرستی نہیں کرے گا' مگر یوکرین کے تازہ حملوں کو دیکھ کر صدر ٹرمپ کے اِس دعوے کی قلعی کھل گئی ہے۔ عالمی میڈیا کے سامنے کیے گئے ڈرامے اور حقیقت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اِس سے قبل بھی اسرائیل اور حماس کو جنگ بند کرنے کے لیے کہا گیا تھا مگر موقع ملتے ہی اسرائیل نے جنگ بندی کو ختم کرتے ہوئے وہ تباہی برپا کی کہ اِس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

پاکستانی وفد کے دورۂ امریکا پر امریکی محکمہ خارجہ نے امید ظاہر کی ہے کہ صدر ٹرمپ اپنے دور میں مسئلہ کشمیر حل کر لیں گے۔ کیسے کریں گے: دونوں ممالک کی قیادت کو مدعو کر کے مذاکرات کے ذریعے یا کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کی حمایت کر کے؟ اِس حوالے سے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ صدر ٹرمپ کے ذہن میں کیا ہے! صدر ٹرمپ کے ذہن میں جو کچھ بھی ہے اُس کو جاننے کے لیے کسی خاص کوشش یا کاوش کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اُن کا ایک ایک عمل بتا رہا ہے کہ وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں' اور وہ جو کرتے ہیں اس کا ذکر نہیں کرتے یا کہہ کر بھول جاتے ہیں۔ ایرانی صدر مسعود پزشکیان گزشتہ کئی مہینوں سے یہ کہتے چلے آ رہے تھے کہ ایران جوہری ہتھیار حاصل کرنے کا خواہاں نہیں مگر ایران کو یورینیم کی افزودگی سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اِس ضمن میں ایران کی تمام تر سرگرمیاں آئی اے ای اے کی زیر نگرانی اور مکمل شفاف ہیں اور اس کی کوئی ایسی تنصیب یا سرگرمی نہیں جو ظاہر نہ کی گئی ہو۔ اِس سب کے باوجود اسرائیل نے امریکا کی زیر سرپرستی ایران کی جوہری تنصیبات پر بمباری کر کے اُنہیں تباہ کر دیا ہے۔ امریکا اِس جنگ میں اسرائیل کی مکمل پشت پناہی کر رہا ہے بلکہ اسرائیل کی طرف سے ایران کو مکمل تباہ و برباد کرنے کی دھمکیاں بھی دے رہا ہے۔ اسرائیل کا ایران پر یہ پہلا حملہ نہیں ہے‘اِس سے قبل وہ کئی مرتبہ اعلانیہ اور کئی مرتبہ غیر اعلانیہ ایران کا نقصان کر چکا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے وہ جس طرح مشرقِ وسطیٰ میں تباہی پھیلا رہا ہے‘ ایران اِس خوں ریزی کے حوالے سے اُس کی ’’ویٹنگ لسٹ‘‘ میں تھا۔ صدر ٹرمپ کا کہنا ہے کہ اسرائیل کے حملہ کرنے سے پہلے انہوں نے مذاکرات کے ذریعے معاملات کو حل کرنے کے لیے کہا تھا جبکہ حملہ کے بعد امریکی وزیر خارجہ مارکو روبیو کا کہنا تھا کہ اسرائیل نے ہمیں مطلع کیا تھا کہ وہ یہ کارروائی اپنی سلامتی کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ ہماری اولین ترجیح مشرقِ وسطیٰ میں تعینات امریکی افواج کا تحفّظ ہے۔ اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے ایران کو سخت تنبیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسے امریکی مفادات یا اہل کاروں کو نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔

ماضی کے تجربات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ امریکا نے جہاں بھی ثالثی کی ہے‘ محض اپنے مفاد میں کی ہے۔ اِن حالات میں کشمیر پر ثالثی کے لیے امریکا کو دعوت دینا کسی بھی طرح پاکستان کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ یہاں یہودی‘ سابق امریکی سفارت کار ہنری الفریڈ کسنجر کی بات کا حوالہ دینا برمحل ہوگا کہ ’’امریکا کے دوستوں نے اس کے دشمنوں کی نسبت زیادہ نقصان اُٹھایا ہے۔‘‘ لہٰذا امریکی صدر کو کشمیر کے مسئلہ میں ثالثی کے لیے دعوت دینا دو بلیوں کا کیک کے تنازعے پر بندر کو ثالث بنانے کے مترادف ہوگا۔

❀❀❀

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ (۳)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اللہ عزّوجل کا تعارف

اب ان اَسماء (رحمان و رحیم) کا پہلی آیت کے ساتھ جو خاص ربط ہے' اُسے سمجھ لیجیے۔ ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ کا ایک تعارف ہمارے سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو اُس کے اسماء وصفات کے حوالے ہی سے جانتے ہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ تو ہمارے علم وفہم' تخیل اور وہم سے بلندتر' وراء الوریٰ' ثم وراء الوریٰ ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ ان دو آیات میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی جو معرفت حاصل ہوئی' اُس میں کہیں بھی کوئی خوف یا ڈرانے والا پہلو نہیں ہے۔ کوئی خوف ناک تصور سامنے نہیں آرہا' بلکہ ہر لفظ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ محبت کے قابل اور محبت کرنے والی' وَدُود اور رحیم ہستی ہے۔

سب سے پہلے لفظِ اللّٰہ ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں نے مختلف آراء ظاہر کی ہیں کہ یہ اَلِہَ یَلَہُ سے ہے یا وَلَہَ یَلِہُ سے۔ ان آراء میں جو چیز مشترک ہے وہ یہ کہ ایک ایسی ہستی جس سے محبت کی جائے' ایک ایسی ہستی جس کی طرف انسان اپنی تکلیف کو رفع کرنے کے لیے اور اپنی حاجت براری کے لیے لپکتا ہے۔ جیسے کسی گائے یا اونٹنی کے بچے کو ماں سے علیحدہ کر کے کہیں باندھا ہوا ہو اور کسی طرح اُس کی رسّی کھل جائے تو جس طرح وہ والہانہ انداز میں اپنی ماں کی طرف لپکے گا' یہ کیفیت اس لفظ کے اندر ہے۔ یہ والہانہ انداز میں محبت کرنا ہے۔ ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا کہ اَلِہَ کے معنی ہیں تَحَیَّرَ کہ انسان متحیّر ہو جائے۔ یعنی وہ ہستی جس کی ذات کی کُنہ تک تو ہم نہیں پہنچ سکتے' سوائے تحیّر (حیرانی) کے ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا' البتہ جس کی طرف ہم لپکتے ہیں' اپنی تکالیف میں اُس

سے مدد چاہتے ہیں‘ مشکلات میں اُس کو پکارتے ہیں۔ اُس سے رزق طلب کرتے ہیں‘ پھر اُس سے محبت کرتے ہیں۔تو لفظِ اللہ میں بھی آپ نے دیکھا کہ خوف پیدا کرنے والا کوئی پہلو موجود نہیں ہے۔

پھر ’’رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ‘‘ کے دو معنی سامنے آئے تھے۔ایک معنی تو پالن ہار‘ پروردگار‘ پرورش کنندہ کا ہے۔اس میں بھی شفقت‘ محبت اور عنایت ہے۔کوئی قہاری والا پہلو‘ کوئی بھی ایسی چیز کہ جس کا خوف سے تعلق بنتا ہو‘ وہ نہیں ہے۔البتہ ایک پہلو اس میں ضرور ہے کہ ربّ کے معنی مالک کے ہیں اور جو مالک ہوتا ہے وہ اپنی ملکیت میں تصرف کرتا ہے۔ اُس تصرف میں اُس کا اپنا اختیار اور اپنی پسند ہی آخری اور فیصلہ کن چیز ہوتی ہے۔ یہاں کچھ ہلکا سا پہلو نکل سکتا ہے کہ مالک اپنی مِلک میں ہر طرح تصرف کرنے میں آزاد ہوتا ہے‘ وہ اس کا پابند نہیں ہے کہ اپنی ملکیت سے ہی پوچھے کہ مَیں کیا کروں اور کیا نہ کروں! مَیں سمجھتا ہوں کہ اس پہلو کی تلافی کے لیے یہ ’’الرَّحْمٰن ‘‘ اور ’’الرَّحِیْم ‘‘ دونوں اسماء جو رحمت سے بنے ہیں‘ اُن کو لایا گیا کہ وہ مالک تو ہے مگر سخت گیر مالک نہیں ہے۔وہ مالک تو ہے لیکن جابر نہیں ہے۔وہ یقیناً مالک ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں‘ اُس کا اختیار مطلق ہے وہ جو چاہے کرے‘ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ رحمٰن بھی ہے اور بیک وقت وہ رحیم بھی ہے۔ چنانچہ اُس ذات میں اگر کسی درجے میں سختی یا جبر کا کوئی پہلو نکلتا تھا‘ یا اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف والہانہ انداز میں بڑھنے کی بجائے اس کے اندر کوئی خوف (awe) کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا تو یہ دو اسماء ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ لا کر اُس کی ایسی تلافی کی ہے کہ وہ مالک ہے مگر انتہائی شفیق‘ نہایت رحیم‘ نہایت وَدُود‘ نہایت رحم کرنے والا۔وہ رحمٰن بھی اور رحیم بھی ہے۔

اِنذار‘ خوف اور تقویٰ

یہ وضاحت مَیں نے اس لیے کی ہے کہ عیسائی مستشرقین نے قرآن اور اسلام پر یہ شدید اعتراض کیا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کا تعارف ایسے انداز میں کراتی ہے جس میں ڈر کا پہلو نمایاں ہے۔اس میں جا بجا یہ کہا گیا ہے کہ اللہ سے ڈرو (اِتَّقُوا

اللہَ) ’ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! انہیں ڈراؤ (اَنْذِرْھُمْ) ۔ بدقسمتی سے اس میں کچھ کوتاہی تو ہمارے مترجمین کی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک پس منظر ہوتا ہے اور کسی زبان کا صحیح مفہوم دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ کو مناسب لفظ مل جائے۔

’’خوف‘‘ کا لفظ عربی زبان کا ہے‘ اس کا ترجمہ ہم اردو میں ’’ڈر‘‘ اور انگریزی میں fear سے کر دیں گے۔ ’’تقویٰ‘‘ کا لفظ بھی عربی زبان کا ہے‘ اُس کا ترجمہ بھی ’’ڈرنا‘‘ ہو جائے گا۔ چنانچہ ’’اِتَّقُوا اللہَ ‘‘ کا ترجمہ عام طور پر یہی کیا جاتا ہے: ’’ڈرو اللہ سے‘‘۔ چنانچہ مختلف الفاظ میں جو فرق اور تفاوت ہے‘ اُس کو ہم صحیح طور پر تراجم میں بیان نہیں کر پائے‘ وگرنہ واقعہ یہ ہے کہ تقویٰ اور شے ہے جبکہ خوف کسی اور شے کا نام ہے۔ اسی طرح اِنْذَار کے معنی ڈرانا نہیں ہے‘ خبردار (warn) کرنا ہے۔ تقویٰ کے معنی ڈرنا نہیں ہے بلکہ اُس میں ایک بچاؤ کا پہلو ہے۔ کسی سعادت مند بچے کو اپنے والد کی ناراضی کا ڈر ہوتا ہے۔ یہ ڈر اور شے ہے جبکہ سانپ‘ بچھو‘ شیر کا ڈر یا کسی غولِ بیابانی کا خوف‘ یہ بالکل دوسری قسم کا ڈر ہے۔ والد سے جو ڈر ہے اُس میں دراصل بنیادی چیز والد کی محبت ہے‘ بچے کے ساتھ والد کی شفقت ہے۔ بچہ یہ نہیں چاہتا کہ میرے والد مجھ سے ناراض ہوں۔ دراصل لفظ ’’تقویٰ‘‘ کا مفہوم یہ ہے‘ لیکن اس کا ترجمہ بھی ہم ڈر سے کر دیں گے۔ خوف کا لفظ بھی قرآن میں آتا ہے‘ وہاں بھی ترجمہ ڈر سے کر دیں گے۔

اِنذار کے معنی خبردار کرنے کے ہیں‘ ڈرانے کے نہیں۔ ایک نابینا شخص سڑک پر چلا جا رہا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ آگے سڑک کُھدی ہوئی ہے‘ تو آپ اُسے خبردار کریں گے کہ دیکھو بھائی! آگے سڑک کھدی ہوئی ہے۔ اگر آپ کو محسوس ہو کہ صرف اندھا ہی نہیں‘ بہرہ بھی ہے تو آپ بھاگ کر اُس کا ہاتھ پکڑیں گے‘ کپڑا پکڑیں گے۔ یہ وہ بات ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تمثیل کے ذریعہ بیان فرمایا:

((إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ النَّاسِ، كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ، جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهَذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِي تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيهَا، فَجَعَلَ يَنْزِعُهُنَّ وَيَغْلِبْنَهُ فَيَقْتَحِمْنَ فِيهَا، فَأَنَا آخُذُ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَهُمْ

يَقْتَحِمُونَ فِيهَا)) (متفق عليه)[۳۰]

’’میری اور لوگوں کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس نے آگ جلائی‘ جب اس کے چاروں طرف روشنی ہوگئی تو پروانے اور پتنگے اس آگ میں گرنے لگے اور وہ شخص انہیں اس میں گرنے سے بچانے لگا لیکن وہ اس کے قابو میں نہیں آئے اور آگ میں گرتے رہے۔ اسی طرح میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے بچاتا ہوں اور تم ہو کہ اسی میں گرتے جاتے ہو۔‘‘

تمہیں حقیقت نظر نہیں آرہی‘ تم صرف اس دنیا کو دیکھ رہے ہو‘ آخرت تمہاری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ وہ جہنم تمہیں نظر نہیں آرہی جبکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دکھا دی ہے۔ مَیں کپڑے پکڑ پکڑ کر تمہیں گھسیٹ رہا ہوں کہ گڑھے میں مت گرو۔ اب یہ انذار کا تصوّر ہے جس میں ہمدردی ہے‘ خلوص ہے‘ خیر خواہی کا پہلو ہے۔ جس کو ڈرایا جا رہا ہے اُس کو ڈرانا مقصود نہیں بلکہ اُس کی بھلائی مدِّنظر ہے۔ درحقیقت ایک تو ہمارے تراجم میں ہر جگہ جو لفظِ ڈر (یا fear) آ گیا ہے تو اس وجہ سے مستشرقین کو کچھ کہنے کا موقع ملا ہے۔

بگڑے معاشرے میں اِنذار کی ضرورت

دوسری بات یہ ہے کہ کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید میں انذار اور تقویٰ پر واقعتاً زور ہے‘ لیکن یہ زور (emphasis) کیوں ہے؟ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اگر ماحول کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔ ایک نارمل ماحول ہوتا ہے اور ایک بگڑا ہوا ماحول ہوتا ہے۔ ایک ہے نارمل اور صحت مند انسان‘ جس کے منہ کا ذائقہ درست ہو اور ایک ہے بخار میں مبتلا انسان‘ جس کا ذائقہ بگڑا ہوا ہو۔ لہٰذا جو بخار میں مبتلا ہے اُسے کڑوی کونین تو دینی ہوگی۔ جب معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو تخویف کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور انذار کی بھی۔ لہٰذا انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت میں ابتداءً تخویف و انذار کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے‘ جس کو علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

جب سوچ بگڑ چکی ہو تو سب لوگ کلامِ نرم و نازک سے بات نہیں سمجھ سکتے۔ سب لوگ محبت کے رمز آشنا نہیں ہوتے۔ وہاں ضرورت ہوتی ہے کچھ سخت گیری کی‘ چاہے وہ زبان ہی کے ذریعہ سے ہو۔ کچھ کوڑے اور تازیانے پڑیں‘ تب انسان جاگتا اور آنکھ کھولتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں‘ ابتدا میں ایک بگڑے ہوئے ماحول سے خطاب ہو رہا ہو تو یقیناً انذار اور ڈرانے کا رنگ غالب ہوگا۔ البتہ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید سورۃ الفاتحہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا تعارف مثبت طور پر کرا رہا ہے‘ اور یہ وہ سورت ہے جو نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جا رہی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ہمارا جو ذہنی و قلبی تعلق ہے وہ سب سے زیادہ اس سورۂ مبارکہ کے ذریعے سے ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کا تعارف اُس کے جن اسماء وصفات سے ہو رہا ہے‘ وہ لفظِ اللہ سے بھی ظاہر ہے‘ لفظِ رب سے بھی ظاہر ہے‘ اور پھر رحمٰن و رحیم کے دو اسماء سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت‘ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت‘ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کو نمایاں کیا جا رہا ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

اب آیئے تیسری آیت کی طرف: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾۔ یہاں ذرا دوسرا رُخ ہے کہ صرف رحمت پر ہی جری نہ ہو جایا جائے بلکہ وہ عادل بھی ہے اور منصف بھی۔ جزا اور سزا دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ جزا وسزا کا وہ جو ایک دن آنے والا ہے‘ اس کا وہ مختارِ مطلق ہے‘ مالک ہے۔ اس پہلو پر ذرا غور کر لیجیے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس میں ہم ’’حقیقت واَقسامِ شرک‘‘ پر کافی وقت لگا کر اس موضوع کو سمجھ چکے ہیں۔(۳۱)

سورۂ فاتحہ کا ایک ایک لفظ شرک کا راستہ روک رہا ہے۔ ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ‘‘ میں شرک کی نفی ہو گئی۔ دینے والا وہ ہے‘ کُل کمالات اُسی میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی دوسرے کے لیے نہ حمد ہے‘ نہ شکر ہے اور نہ ہی اُس کے لیے انسان کے پاس تعریف باقی رہ گئی ہے۔ یہی چیز تو شرک کا ذریعہ بنتی ہے کہ کسی شے کی اتنی ہیبت ذہن پر طاری ہو جائے کہ انسان اُس کے سامنے بے ساختہ جھک جائے۔ کسی کے مشکور اور متشکّر ہونے کا جذبہ اتنا شدید ہو

کہ انسان اُس کے سامنے سر جھکا دے۔ لہٰذا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' سے بھی درحقیقت شرک کی نفی ہوتی ہے۔

ایک دوسرا شرک دنیا میں ہمیشہ رہا ہے اور وہ ہے شفاعتِ باطلہ کا شرک کہ ہماری کئی ہستیاں ایسی ہیں جو ہمیں وہاں بچا لیں گی۔ آخرت کو مانتے ہیں' جزا اور سزا کو مانتے ہیں' لیکن کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں جو ہماری سفارش کریں گی اور ہمیں چھڑا لیں گی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ کہ بندے کا ایمان بالآخرۃ ہونے کے باوجود نہ ہونے کے برابر ہو جائے گا' بالکل غیر مؤثر ہو جائے گا۔ تیسری آیت میں درحقیقت اس تصور کی تردید اور نفی کی گئی ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ میں سب سے پہلے تو اس بات کا اظہار ہو گیا کہ ''یومُ الدِّین'' یعنی جزا و سزا کا دن آ کر رہے گا۔ دین کا بنیادی مفہوم جزا و سزا اور بدلہ ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: دِنَّاھم کَمَا دَانُوا! (ہم نے اُن کو بدلہ دیا جیسا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا۔) اسی طرح عربی کا مقولہ ہے: کَمَا تُدِیْنُ تُدان! (جیسا کرو گے' ویسا بھرو گے۔) یہ جزا اور سزا کا تصور ہے۔ عربی زبان میں قرض کو ''دَین'' کہتے ہیں۔ اتنی رقم آپ نے مجھے قرض دی ہے' وہ مجھے آپ کو لوٹانی ہے۔ چنانچہ ''د ی ن'' کے مادہ میں لوٹائے جانے کا تصور ہے' جیسے کہ بدلہ میں ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا اس کی جزا و سزا آپ کو لوٹا دی جائے گی۔ اگر آپ نے کسی کو کوئی چیز اس نیت سے دی کہ واپس نہیں آنی' تو وہ تحفہ' عطیہ' ہدیہ یا ہبہ ہے' لیکن جو چیز پلٹ کر واپس آنی ہے وہ ''دَین'' ہے۔ دِین اور دَین میں صرف زیر اور زبر کا فرق ہے' بنیادی حروف تو وہی ہیں۔ اس سے آپ کو عربی زبان کے معنی سمجھنے میں ایک بصیرت حاصل ہو گی۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ اللہ اُس دِن کا مالک ہے جو بدلے کا دن ہے' جزا و سزا کا دن ہے۔

عقلِ انسانی اور فطرتِ انسانی انسان کو یہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ انسانی اعمال ضائع ہونے والے نہیں ہیں' بدلہ ضرور بالضرور ملنا چاہیے۔ یا تو ہم یہ مانیں کہ خیر خیر نہیں ہے اور شر شر نہیں ہے' ہماری نگاہ کا دھوکا ہے' تب تو بات ٹھیک ہو جائے گی' ورنہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں جو خلقِ خدا کے خادم ہیں' اُن کے لیے تو تکلیفیں ہیں' مصیبتیں ہیں'

آزمائشیں ہیں‘ اور جو کوئی اصولِ زندگی نہیں رکھتے‘ اُن کے لیے عیش و آرام ہے‘ جدھر سے ہاتھ پڑ جائے اُدھر سے نکال لو۔ by hook or by crook جس طریقے سے بھی ہو سکے۔ انسان اگر عیش و آرام حاصل کرنے پر تُل جائے تو ایسا آدمی یہاں عیش کرتا ہے‘ اللّے تللّے کرتا ہے۔ اب اگر کوئی اور زندگی نہیں ہے‘ جزاو سزا کی جگہ نہیں ہے تو پھر یا تو یہ کہا جائے کہ اللہ بہت ظالم ہے‘ اگر واقعتاً ہے (معاذ اللہ!)۔ درحقیقت یہ ساری چیزیں آپس میں باہم ملی ہوئی ہیں۔ یہ بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ جنہیں خدا کے وجود پر پورے وثوق کے ساتھ یقین نہیں ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ اُس کے اندر تمام محاسن اور خوبیاں جمع ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کائنات کا خالق ایسا ظالم ہوگا کہ خیر کرنے والوں کے لیے تو یہاں پر مصیبتیں اور مشکلات ہوں جبکہ جو بدی کی راہ اختیار کریں یا کسی اصول وضابطے کے پابند نہ ہوں‘ اُن کی زندگی میں یہاں عیش و آرام ہو! اس میں اگر کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو وہ یہ کہ ایک دن (یَوۡمُ الدِّیۡنِ) آئے اور اُن کا بھرپور حساب کتاب ہو‘ اور اس کے بعد ایک زندگی ہو‘ جس میں پوری جزا یا سزا مل سکے۔ یہ عقل وفطرت کا تقاضا ہے۔ اسی بات کو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا:

﴿یٰبُنَیَّ اِنَّہَاۤ اِنۡ تَکُ مِثۡقَالَ حَبَّۃٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَکُنۡ فِیۡ صَخۡرَۃٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِہَا اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۶﴾﴾ (لقمان)

’’اے بیٹے! اگر وہ (نیکی یا بدی) رائی کے دانے کے برابر بھی ہو‘ پھر خواہ وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں میں یا زمین کے اندر ہو (کہیں بھی وہ عمل کیا گیا ہو‘ اللہ کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہے) اللہ اُسے سامنے لے آئے گا۔ یقیناً اللہ بہت باریک بین‘ ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔‘‘

شفاعتِ باطلہ کی نفی

یہاں تک تو عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ نے پہنچا دیا‘ اب اس سے آگے ایک قدم اور ہے جو سورۃ فاتحہ اُٹھا رہی ہے: ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾۔ اس لیے کہ شیطان بھی تو

بہرحال آخری بات تو مان رہا ہے کہ قیامت تک انسان کے ساتھ اُس کی جنگ جاری رہے گی‘ اُسے مہلت ملی ہوئی ہے۔ جو انسان یہاں تک آجاتا ہے اُسے شیطان ایک اور پٹی پڑھاتا ہے کہ ہاں بات تو صحیح ہے‘ تمہاری عقل غلط نہیں کہہ رہی‘ تمہاری فطرت صحیح کہہ رہی ہے‘ جزا و سزا ہونی چاہیے‘ ع گندم از گندم بروید جو ز جو! یقیناً صحیح ہے‘ نیکی کا نیک بدلہ ملنا چاہیے‘ بدی کی سزا ملنی چاہیے‘ لیکن کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں کہ جن کی اگر کچھ ڈنڈوت کرو‘ اُن کی پوجا پاٹ کرو‘ اُن کی کچھ سیوا کرو‘ تو پھر وہاں کی پکڑ سے بچ جاؤ گے‘ یہ ہستیاں تمہاری سفارشی بن جائیں گی۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ جو ان دیویوں کو پوجتے تھے‘ وہ کہتے تھے: ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (یونس:۱۸) ”یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں!“ یہ ہمیں وہاں چھڑائیں گے‘ ہماری سفارش کریں گے۔

ایک اور بات ذہن میں رکھیے کہ انسان نے جب بھی اپنے ذہن کے محدود پیمانوں سے ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کو ناپا تو اس میں اُس نے بہت ٹھوکریں کھائیں۔ اس دنیا میں ہم کسی کو دوست رکھتے ہیں تو ہماری دوستی میں ایک کمزوری دَر آتی ہے۔ گہرا تجزیہ کریں تو نظر آئے گا کہ ہمارے تحت الشعور میں یہ بات ہوتی ہے کہ کبھی ضرورت کے وقت ہمارا دوست ہمارے کام آئے گا‘ اس لیے دوستی نبھانی چاہیے۔ جب انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دوست وقت پر کام آتا ہے تو اس احساس کے تحت وہ دوستی نبھانے کے لیے کسی وقت دوست کا ناجائز تقاضا بھی پورا کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ جو کچھ مجھ سے اس وقت چاہتا ہے یہ صحیح تو نہیں ہے مگر یہ دوست ہے اور مجھے یہ کرنا ہے۔ تجزیہ کیجیے تو بنیاد میں یہی بات ہے کہ کبھی مجھے بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ کبھی یہ میرا مددگار ہوگا‘ میرا سہارا بنے گا۔ یہ وہ تصور ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ بھی چسپاں کردیا گیا ہے۔ یقیناً اُس کے بھی دوست ہیں‘ اولیاء اللہ ہیں‘ اس میں کوئی شک نہیں۔ قرآن مجید گواہی دیتا ہے:

﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾﴾ (یونس)

”آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی غم ہے اور نہ وہ حُزن سے دوچار ہوں گے۔“

اب یہ جو ولایت اور دوستی کا تصور ہے‘ اسے جب ہم نے اپنی سطح پر‘ اپنے پیمانے پر جانچا اور پرکھا تو اس کے ساتھ ایک وہ پہلو بھی شامل کر دیا کہ دوستوں کا کہنا وہ کیسے ٹالے گا! دوست اگر کسی کی سفارش کریں گے تو کیسے ممکن ہے کہ اُس کی سفارش قبول نہ ہو جبکہ ہم اپنے دوستوں کی باتیں مانتے ہیں۔

غور کیجیے کہ قرآن کریم کس کس طریقے سے ان چیزوں کی نفی کرتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں شرک کا تین اسلوبوں سے ابطال کیا گیا ہے۔ ابتدا اور اخیر میں تو مثبت انداز ہے جو سورۂ فاتحہ میں ہے۔ فرمایا: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ کُل شکر اور ثنا اُس اللہ کے لیے ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا‘‘ ﴿وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ﴾ ’’اور نہ ہی کوئی اُس کا ساجھی ہے بادشاہی میں (اختیار میں)‘‘ ﴿وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ (الاسراء:۱۱۱) ’’اور نہ ہی کوئی اُس کا دوست اور ولی ہے کسی کمزوری کے باعث۔‘‘ ’’ذُل‘‘ کہتے ہیں عاجزی کو۔ کسی عاجزی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا‘ جیسے تم کسی کو اپنا دوست بناتے ہو اور تمہیں احساس ہوتا ہے کہ یہ کسی آڑے وقت میں میرے کام آئے گا۔ یہ جو آپ کے تحت الشعور میں ایک کمزوری مخفی ہے جس کے تحت آپ اپنے دوست کی کسی وقت ناجائز بات بھی ماننے پر اپنے آپ کو مجبور محسوس کرتے ہیں‘ اللہ تعالیٰ اس کمزوری سے قطعاً پاک ہے۔

رشتہ داریوں میں تو یہ ہوتا ہی ہے کہ اب داماد آ گیا ہے‘ اس کی بات کیسے ٹال دی جائے؟ بہنوئی کی بات کیسے ٹال دی جائے؟ جس طریقے پر یہ معاملہ ہوتا ہے وہ ہر معاشرے کا اپنا طریق کار ہے۔ کہیں سالے کی اہمیت زیادہ ہے تو کہیں بھائی کی۔ کہیں بھائی بھائی کو زیادہ تولے گا‘ کہیں بھائی بہنوئی یا سالے کو زیادہ تولے گا۔ کہیں سسرالی رشتوں کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے اور کہیں رحمی رشتوں کی۔ رشتہ داری میں لازمی طور پر کچھ نہ کچھ ماننا پڑتا ہے‘ کہیں نہ کہیں کنّی دبتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اس تصور کو ذہن سے یکسر نکال دو‘ اُس کی کنّی کسی سے نہیں دبتی۔ اگر اُس کے بھی دوست ہیں تو وہ اس

بنیاد پر نہیں ہیں کہ اُسے کوئی عاجزی لاحق ہو‘ کوئی کمزوری‘ ضعف یا احتیاج ہو کہ جس کی وجہ سے وہ دوست بنائے ہوئے ہے ﴿وَلَمۡ یَكُنۡ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ ۔

یہ ہے شفاعت کا ہمارا وہ تصور جس کی قرآن نفی کر رہا ہے۔ ﴿مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝﴾ ’’وہ روزِ جزا کا مالک ہے‘‘۔ اسی ’’روزِ جزا‘‘ کو قرآن مجید میں بار بار سامنے لایا گیا ہے۔ وہاں پکار ہوگی‘ ندا ہوگی: ﴿لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡیَوۡمَ ؕ﴾ ’’آج کس کے لیے بادشاہی ہے؟‘‘ ﴿لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ۝١٦﴾ (المؤمن) ’’اللہ کے لیے ہے جو تنہا ہے‘ اکیلا ہے۔‘‘

اسی شفاعتِ باطلہ کی نفی کہیں بایں الفاظ ہوتی ہے:

﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ﴾

’’کون ہے جو شفاعت کر سکے گا اُس کے ہاں‘ مگر اُس کی اجازت سے!‘‘

ہاں! شفاعت اذنِ ربّ سے ہے‘ اللہ کی اجازت سے ہے۔ پھر وضاحت کر دی گئی کہ شفاعت اس بات سے مشروط ہوگی کہ کوئی شفاعت کرنے والا غلط بات نہیں کر سکے گا۔ اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ کیا کوئی اس انداز سے اللہ کے روبرو شفاعت کر سکے گا کہ آپ نہیں جانتے‘ مَیں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اصل معاملہ یہ ہے! کوئی ہے جو اللہ کو پڑھا سکے اور سکھا سکے؟ یہی وجہ ہے کہ آیت الکرسی میں ان دو چیزوں کو جوڑا گیا ہے:

﴿یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۵)

’’وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔‘‘

جب علمِ الٰہی اور غیر اللہ کے علم کا کوئی تقابل ہی نہیں‘ وہ کوئی بھی ہوں‘ انبیاء ورسل (علیہم السلام) ہوں‘ اولیاء اللہ ہوں‘ ملائکہ ہوں‘ ان سب کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ نے جتنا علم انہیں دے دیا ہے بس اُتنا ہی جانتے ہیں‘ تو وہاں یہ انداز تو کوئی نہیں اختیار کر سکتا کہ یہ آدمی اچھا ہے‘ یہ بات آپ کے علم میں نہیں ہے‘ مَیں آپ کو بتا رہا ہوں! اسی لیے وہاں شفاعت کو علم سے جوڑا ہے۔

مزید برآں‘ سورۃ النبا میں اس کو بھی واضح کر دیا:

﴿يَوۡمَ يَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝۳۸﴾

’’جس روز کھڑے ہوں گے جبریل اور تمام فرشتے صفیں باندھے۔ وہ کوئی بات نہ کر سکیں گے‘ سوائے اُس کے جسے رحمٰن کی طرف سے اجازت مل جائے اور وہ بات بھی درست کرے۔‘‘

اُس روز روح الامین (جبریل علیہ السلام) اور تمام ملائکہ سب کے سب صفیں باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے اور دَم مارنے کا یارانہ ہوگا‘ کوئی چوں نہ کر سکے گا‘ کوئی بات نہ کر سکے گا‘ سوائے اُس کے جسے رحمٰن کی طرف سے اجازت مل جائے۔ مزید یہ کہ اجازت ملنے کے بعد بھی وہ بات کہے تو درست کہے‘ کوئی غلط بات کہنے کا وہاں کوئی تصور نہیں ہوگا۔

دراصل یہ آیت مبارکہ ﴿مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝﴾ آخرت کی جواب دہی کے بارے میں ہے‘ محض اثباتِ آخرت نہیں۔ یہ سورت وہاں سے شروع ہوتی ہے کہ جہاں تک فطرتِ انسانی انسان کو لا سکتی ہے۔ وہاں تک تو انسان پہنچا ہوا ہے‘ وہاں سے آگے کی بات ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ ایک جزا و سزا کا دن ہے‘ ایک دوسری زندگی ہے یہ تو گویا فطرتِ انسانی اور عقل انسانی از خود یہاں پہنچ گئی ہے۔ اب جو ایک اضافی مغالطہ ہو سکتا ہے‘ وہ وسوسہ جو شیطان پیدا کرتا ہے‘ تاکہ اس علم کے باوجود انسان غلط راستے پر چلتا جائے‘ اُس میں جسارت‘ ڈھٹائی اور جرأت پیدا ہو جائے‘ تو وہ شفاعتِ باطلہ کا تصور ہے کہ کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت میں خلل انداز ہو سکے‘ جو اُس کے فیصلوں کو بدلوا سکے۔ ایک جہلاء کا انداز ہوتا ہے اور اشعار میں کس کس طرح کی باتیں آ جاتی ہیں۔ کہیں کوئی ملنگ یہ پڑھتا ہوا گزر رہا ہوگا: ؎

خدا جنھوں پکڑے چھڑا لے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
محمدؐ دے پکڑے چھڑا کوئی نئیں سکدا!

اس کی کوئی تاویل کرنے پر آئے اور اِدھر سے‘ اُدھر سے کھینچ تان کر کوئی ایسا مفہوم نکال

دے کہ اسے درست قرار دے دے تو الگ بات ہے۔ ورنہ ایک عام آدمی پر اس کا یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' یہ قدرت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو بدلوا دیں۔ پھر تو وہ اللہ تعالیٰ سے بھی بالاتر ہستی ہوئی نا! اس طرح تو یہ معاملہ شرک نہیں' بلکہ شرک سے بھی بالاتر ہے۔

بنی اسرائیل میں شفاعتِ باطلہ کا تصوّر

یہ صرف بُت پرستوں کا معاملہ نہیں ہے کہ عرب کے بُت پرست یہ سمجھتے تھے کہ یہ جو ہمارے دیوی' دیوتا ہیں' یہ لات ومنات اور عزّیٰ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں' بلکہ سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل سے جہاں خطاب شروع ہوا ہے وہاں بھی اور خطاب کے آخر میں بھی یہ مضمون بڑے شدّ ومدّ کے ساتھ آیا ہے:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾﴾ (البقرۃ)

''ڈرو اُس دن سے (بچو اُس دن کی حسرت ناکی سے) کہ جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آسکے گی' اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول ہوگی' اور نہ بدلے میں کوئی چیز قبول کی جائے گی' اور نہ ہی انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

یہ ذہن میں رکھیے کہ شفاعت کے بارے میں قرآن مجید میں دو انداز بیان ہوئے ہیں۔ کہیں تو شفاعت کی کلیۃً نفی ہے: ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''کوئی شفاعت اس سے قبول نہیں ہوگی۔'' کہیں اثبات ہوتا ہے تو ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ ''مگر اُس کی اجازت کے ساتھ۔'' لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہاں تک آنا چاہیے' اس سے آگے کا کوئی تصور ہے تو بات اس کے بالکل برعکس ہو جائے گی۔ قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں شفاعت کی نفی کلی ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ نفی کُلّی شفاعتِ باطلہ کی ہو رہی ہے۔ جہاں یہ تصور قائم ہو جائے کہ کوئی ہستی اتنی زور آور ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے آگے رکاوٹ بن کر کھڑی ہو سکتی ہے تو یہ شفاعتِ باطلہ ہے۔ یا یہ تصور کہ کسی سے اللہ کی کنّی اتنی دبتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بات ماننے پر مجبور ہے' یہ بھی شفاعتِ باطلہ ہے۔ اس کی نفی پورے

شدّ ومدّ کے ساتھ کی گئی ہے۔

ذرا سی ترتیب کے فرق کے ساتھ پہلے پارے کے پندرھویں رکوع میں پھر یہ مضمون آیا ہے۔فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴿۱۲۳﴾﴾

’’اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آسکے گی، اور نہ اُس سے فدیہ قبول کیا جائے گا' اور نہ اسے کوئی شفاعت فائدہ دے سکے گی، اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔‘‘

حصّہ دوم (عبادت واستعانت) کی تفہیم

اس سورۂ مبارکہ کی تیسری آیت کے مطالعہ کے بعد اب ان تینوں کو جمع کر لیجیے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

اب وہ ترازو ذہن میں لائیے جو مَیں نے حدیثِ قدسی کے حوالے سے بنا کر دکھایا تھا کہ سورۂ فاتحہ کے دو حصے ہیں' پہلا حصہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہے' آخری حصہ کُل کا کُل بندے کے لیے ہے' درمیان کا حصہ برابر برابر تقسیم ہے' تو نصفین ہو جائیں گے' ایک نصف اللہ کے لیے اور دوسرا نصف بندے کے لیے۔ لہٰذا یہ ایک جملہ بنا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾۔ اس کا اگر ایک جملہ کی شکل میں ترجمہ کیا جائے تو وہ یوں ہوگا: ’’کُل شکر اور کُل ثنا اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے' جو رحمٰن ورحیم ہے' اور جو جزاوسزا کے دن کا مختارِ مطلق ہے۔‘‘ ادبی ولغوی اعتبار سے یہ ایک جملہ بن گیا۔

عبد اور عبادت کا مفہوم

اس کے بعد درمیانی (چوتھی) آیت میں عجیب بات یہ ہے کہ ایک آیت میں دو جملے

ہیں: ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ﴾ مکمل جملہ ہے۔ فعل‘ فاعل اور مفعول تینوں مل کر جملہ بنتے ہیں۔ پھر درمیان میں ’’وَ‘‘ ہے جہاں سے ترازو کو پکڑا جاتا ہے۔ ﴿اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ دوسرا جملہ ہے۔ پہلے ہم اِیَّاکَ نَعۡبُدُ پر غور کرتے ہیں۔ اصل لفظ جو سمجھنے والا ہے وہ ہے نَعۡبُدُ۔ یہ عَبَدَ یَعۡبُدُ سے فعل مضارع بنتا ہے اور جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ عربی زبان میں فعل مضارع میں حال بھی آجاتا ہے اور مستقبل بھی۔ چنانچہ نَعۡبُدُ کے معنی ہوں گے: ’’ہم عبادت کرتے ہیں۔‘‘ یہ فعل حال ہوگیا۔ اور یہ بھی ہوں گے کہ: ’’ہم عبادت کریں گے۔‘‘ یہ فعل مستقبل ہوا اور فعل مضارع میں یہ دونوں زمانے پائے جاتے ہیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ ’’ نَعۡبُدُ ‘‘ سے پہلے لفظ ’’اِیَّاکَ ‘‘ آیا ہے۔ اگر یہاں ’’نَعۡبُدُکَ ‘‘ ہوتا تو ترجمہ یوں کیا جاتا: ’’ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور کریں گے‘‘ لیکن چونکہ ضمیر مفعولی ’’کَ ‘‘ کو فعل سے پہلے لایا گیا اور اس کے لیے ’’اِیَّا‘‘ کا اضافہ کیا گیا‘ یعنی ’’ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ ‘‘ تو اس میں مزید تاکیدی مفہوم پیدا ہوگیا۔ یعنی: ’’ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی عبادت کریں گے۔‘‘ پہلے ترجمہ کے اعتبار سے یہ اظہارِ حال ہے اور اس لیے مَیں اس طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ اگر فی الواقع ایسا نہ ہو‘ اور یہ جملہ زبان سے ادا کیا جا رہا ہو تو ایک احتمال کذبِ زبانی کا ہوگیا۔ زبان سے کہتے رہیں ’’ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں‘‘ اور عملاً نہ کرتے ہوں‘ تو یہ کہنا بجائے کوئی کریڈٹ دلوائے‘ کوئی فائدہ پہنچوائے‘ ایک جھوٹ ہے‘ کیوں کہ اس میں اظہارِ حال کا پہلو ہے‘ اور وہ ہے مخالفِ واقعہ‘ جو مطابق واقعہ نہیں ہے تو اس میں یقیناً جھوٹ کا احتمال پیدا ہوجائے گا۔ اگر اس کا ترجمہ مستقبل سے کرتے تو پھر یہ ایک عہد اور معاہدہ ہے: ’’ہم تیری ہی عبادت کریں گے۔‘‘

عبادت کے معنی کیا ہیں؟ عبد‘ درحقیقت ضد ہے مالک کا۔ ایک دوسرے کے متضاد مفہوم کے جو الفاظ ہوتے ہیں‘ ان سے بھی ہم ان الفاظ کو سمجھ سکتے ہیں۔ عربی میں کہا جاتا ہے: تُعۡرَفُ الۡاَشۡیَاءُ بِاَضۡدَادِھَا تو متضاد الفاظ (antonyms) کے حوالے سے بھی مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ ایک طرف مالک یا خود مختار اور دوسری طرف عبد یا غلام ہے۔ عبد

وہ ہے کہ جو اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے کچھ نہ کر سکے‘ بلکہ اس کے اوپر کسی اور کی مرضی اور اختیار مسلط ہو۔ فارسی زبان میں عبد کے لیے لفظ بندہ آتا ہے اور اسی سے بندگی بنتا ہے۔ ؎

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

اور عبادت کے لیے سادہ ترین لفظ ’’بندگی‘‘ ہوگا۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ (الذّٰریٰت)

’’مَیں نے جِنّوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔‘‘

زندگی آمد برائے بندگی　　　زندگی بے بندگی شرمندگی!

البتہ اس لفظ کے اصل مفہوم کو سمجھنے کے لیے چند چیزیں نوٹ کر لیجیے۔ ایک تو عرب کہے گا: ’’البَعِيْرُ الْمُعَبَّد‘‘ وہ اُونٹ جو خوب سدھایا ہوا ہو۔ آپ گھوڑے کا تصور کر لیجیے‘ ہم لوگ اونٹ سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ ایک گھوڑا وہ ہے جو کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا اور ایک گھوڑا وہ ہے جسے خوب سدھا لیا گیا ہے‘ وہ اپنے مالک کے اشارے پر چلتا ہے‘ اس کے لیے ذرا سا لگام کا اشارہ ہی کافی ہے۔ اسے پتہ چل جائے کہ میرا مالک کیا چاہتا ہے‘ وہ بالکل اسی طرح چلتا ہے۔ ’الفرسُ المُعَبَّد یا البَعِیرُ المُعَبَّد وہ گھوڑا یا اونٹ جو اپنے مالک کا بالکل مطیع فرمان بن جائے‘ فرماں بردار بن جائے۔ الطریقُ المُعَبَّد کہتے ہیں وہ راستہ جس کو چل چل کر ہموار کر دیا گیا ہو۔ ایک راستہ وہ ہے کہ جس پر عام لوگ ابھی تک چلے نہیں ہیں۔ آپ کہیں کسی جنگل میں راستہ بنا رہے ہیں تو اس راستے کی شکل کوئی اور ہوگی‘ اور جہاں لوگ چلتے رہے ہوں‘ تو وہ ایک طرح کا ہموار راستہ بن جاتا ہے‘ چاہے پگڈنڈی ہو۔ یہ ہے اصل میں لفظ عبد کی باطنی حقیقت!

کوئی چیز جو کہ سرنگوں ہو‘ پامال ہو‘ اشاروں پر چلنے والی ہو‘ فرماں بردار ہو‘ وہ ہے عبد۔ البتہ یہ کیفیت کبھی تو جبری ہو سکتی ہے‘ جیسے انگریز آئے اور انہوں نے ہمیں اپنا غلام بنا لیا‘ اب ہم ان کا کہنا مان رہے ہیں۔ اس جبری اطاعت پر بھی قرآن مجید میں لفظِ عبادت

کا اطلاق ہوا ہے۔ جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے دربار میں دعوت دینے کے لیے‘ اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے گئے‘ تو فرعون نے بڑے طنطنے اور غرور کے ساتھ کہا: ﴿وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ (المؤمنون) ’’ان دونوں کی قوم تو ہماری غلام قوم ہے۔‘‘ ایک محکوم قوم کے افراد ہو کر ان کی اتنی جرأت ہوگئی ہے کہ آج ہمارے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوئے ہیں اور ہم سے کہہ رہے ہیں کہ ہم ان کو اللہ کا نبی و رسول مانیں اور ان کی اطاعت کریں! اور ہم ان کو مان لیں کہ یہ اُس ہستی کے نمائندے ہیں جسے یہ اپنا ربّ کہتے ہیں۔ کسی کو رسول ماننے کا معنی یہ ہے کہ آپ کو اُس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ یہ کیا اُلٹی گنگا ہے کہ ہماری محکوم قوم کے افراد آج ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں کہ ہم ان کی اطاعت کریں!

ایک تو فرعون نے یہ لفظ استعمال کیا بندگی کے مفہوم میں‘ پھر ایک دوسرے موقع پر فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر یہ طنز کیا: ﴿اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا ﴾ (الشعراء:۱۸) ’’کیا ہم نے تمہیں چھوٹے ہوتے اپنے ہاں پالا نہیں تھا؟‘‘ مَیں اگر اس کا مفہوم ادا کروں تو اپنی گفتگو میں ہم کہیں گے: ’’اے موسیٰ! کیا تم ہمارے ہی ٹکڑوں پر نہیں پلے ہو؟‘‘ ہمارے ہی گھر میں نہیں رہے؟ نُرَبِّكَ وہی لفظ آ گیا۔ ہم نے تمہیں پالا پوسا ہے‘ پرورش کی ہے‘ اور آج تم ہمیں اپنے رب کی بندگی کی دعوت دینے آ گئے ہو؟ ہماری بلّی اور ہمیں ہی میاؤں! تو موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: تمہیں یہ تو یاد رہا کہ تم نے مجھے اپنے گھر میں پالا پوسا ہے‘ کھلایا پلایا ہے‘ لیکن:

﴿وَتِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۲۲﴾﴾ (الشعراء)

’’اور یہ وہ احسان ہے جو تم مجھے جتلا رہے ہو جس کے عوض تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے!‘‘

میری پوری قوم کو غلام بنایا ہوا ہے۔ ان سے جبری مزدوری کروا رہے ہو‘ بیگار لے رہے ہو‘ اور انہیں ظلم کی چکی میں پیسا ہوا ہے‘ وہ تمہیں یاد نہ آیا‘ اور اس قوم کے ایک فرد کو تم نے اپنے خاندان کے ساتھ اپنے محل میں رکھ کر اُس کی پرورش کر دی تو وہ احسان یاد ہے۔ تو یہ لفظِ

عبد اُس تعلق (relationship) کو ظاہر کرنے کے لیے کہ جو آلِ فرعون اور بنی اسرائیل میں اُس وقت تھا‘ قرآن مجید میں دو جگہ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا مجرد اطاعت‘ مجرد غلامی بھی اس کا مفہوم ہے‘ چاہے وہ جبری ہی ہو‘ لیکن اصطلاحاً لفظ ’’عبد‘‘ اللہ کے لیے آئے گا اور عبادت کے لفظ میں اضافی طور پر یہ مضمون شامل ہوگا کہ یہ بندگی‘ یہ اطاعت‘ یہ عاجزی اور یہ تذلل زبردستی کی نہ ہو‘ مارے باندھے کی نہ ہو‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اطاعت کی جائے‘ تب وہ عبادت بنے گی۔

جذبۂ تشکّر کا نتیجہ: جذبۂ پرستش

عبد اور معبود کا یہ تعلق سورۃ فاتحہ کے آغاز ہی سے ظاہر ہو رہا ہے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝﴾ وہ منعِم ہے‘ وہ محسن ہے‘ وہ رزّاق ہے‘ وہ خالق ہے‘ وہ پروردگار ہے‘ وہ پالن ہار ہے‘ وہ رحیم ہے‘ وہ رحمٰن ہے۔ اس تصور کے نتیجے میں وہ جذبہ اُبھر کر انسان کو آمادہ کرتا ہے کہ ہمہ تن اپنے آپ کو اُس ہستی کے سامنے ڈھیر کر ڈالے‘ اُس کے قدموں میں ڈال دے‘ اُس کے سامنے بچھا دے۔ درحقیقت ترازو کا وہ پلڑا جو پہلی تین آیات کی تین ڈوریوں پر مشتمل ہے وہ جڑا ہوا ہے چوتھی آیت سے ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ﴾۔ جس اللہ کا یہ مقام و مرتبہ اُس کے اسماء و صفات سے ظاہر ہو رہا ہے‘ جواب میں اُس کے لیے ہمارے پاس کیا ہونا چاہیے تھا؟ عبادت! کہ بندہ اُس کے انعامات اور احسانات کے تصور سے اور اُس کے جذبۂ تشکر اور محبت سے سرشار ہو کر‘ اُس کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دے۔

اس بات کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ نے واضح کیا ہے۔ اگرچہ جمہور کے نزدیک مجرد لفظ عبادت کے معنی ہیں کسی کے سامنے اپنے آپ کو گرا دینا (العبادة التذلل)‘ لیکن یہ گرا دینا جبراً بھی ہو سکتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے نزدیک اللہ کی عبادت یہ ہے: العبادة تجمع اثنين: غايةَ الحُبِّ مع غاية الذُّلِّ والخُضوع یعنی دو چیزیں جمع ہوں گی تو عبادت بنے گی: ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہا درجے کی محبت اور دوسرے انتہا درجے کی عاجزی اور تذلل یعنی اُس کے سامنے اپنے آپ کو بچھا دینا۔

سورۂ لقمان کے درس کے سلسلے میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جذبۂ تشکّر سے عبادت کا بڑا گہرا ربط و تعلق ہے‘ اس لیے کہ جب انسان کسی ایسی ہستی کا شکر کرنا چاہتا ہے کہ جس کی وہ خدمت بھی بجا لاتا ہو‘ تب تو معاملہ مختلف ہے۔ والدین کے آپ پر احسانات ہیں اور آپ بھی ان پر احسان کرنے والے ہیں کہ آپ نے ان کی مقدور بھر خدمت کی۔ اس سے کچھ نہ کچھ دل میں اطمینان ہو جاتا ہے۔ اگر اولاد سعادت مند ہو اور والدین کا انتقال ہو جائے تو دل میں ایک حسرت رہتی ہے کہ ہمیں کوئی زیادہ موقع نہ ملا کہ ان کی خدمت کر سکتے۔ بہرحال دنیا میں کسی کا بھی کوئی احسان ہو تو فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ احسان کا بدلہ چکانا چاہتی ہے:

﴿هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ ۞﴾ (الرحمٰن)

”احسان کا بدلہ کیا ہو سکتا ہے سوائے احسان کے!“

جس نے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے تم بھی اس کے ساتھ بھلائی کرو۔ یہ جزا بھی شکر کا بدلہ ہے‘ یہ بھی فطرت کا تقاضا ہے‘ لیکن کوئی ہستی ایسی بھی ہے جس کے احسانات و انعامات کا تو آپ کو بڑا گہرا شعور حاصل ہو گیا لیکن آپ اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ مثلاً سورج کے بارے میں کسی نے سوچا کہ یہ ہمارا بڑا محسن ہے‘ ہماری فصلیں اسی سے پکتی ہیں‘ یہ ہواؤں کا چلنا‘ یہ بارشوں کا برسنا‘ ہمارا سارا نظام اسی سے چلتا ہے۔ کون ہے جو سمندر کے بخارات کی بوندوں کو اُوپر اٹھا کر لے جا رہا ہے؟ چنانچہ جس کو بھی یہ شعور حاصل ہو گیا تو اس کے دل میں اس سورج کے لیے شدید جذبۂ شکر پیدا ہو گیا‘ لیکن وہ سورج کی کیا خدمت کرے؟ کیا سیوا کرے؟ کیا بدلہ چکائے؟ جہاں احساسِ شکر تو ہو لیکن انسان کوئی بدلہ نہ چکا سکتا ہو‘ وہاں وہ ہاتھ جوڑتا ہے‘ حمد کے ترانے گاتا ہے‘ اُس کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتا ہے‘ سر جھکا دیتا ہے‘ سجدہ کر دیتا ہے۔ یہ درحقیقت اُس کا جذبۂ تشکّر ہے‘ جس نے جذبۂ پرستش کی شکل اختیار کر لی۔ سر جھکانا کیا ہے؟ عاجزی ہے۔ رکوع اس عاجزی کے اظہار کا ابتدائی درجہ ہے اور سجدہ گویا انتہا درجے کی عاجزی کا اظہار ہے۔

غور کیجیے کہ سورج کو سجدے کیوں کیے گئے؟ اس کی یہی توجیہہ ہے۔ انسان بغیر کسی

سبب کے یوں ہی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ آخر سورج کی پرستش ہو رہی ہے۔ لوگ انتظار میں کھڑے ہیں کہ جب سورج ذرا سا سر نکالے تو اس کی پوجا پاٹ شروع ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تین اوقات میں ہمارے لیے سجدہ کرنا حرام کر دیا گیا ہے۔ طلوعِ شمس کے وقت سجدہ نہ ہو' مبادا کسی کو خیال ہو جائے کہ اِس کا سورج کی پرستش سے کوئی تعلق ہے۔ غروبِ شمس کے وقت سجدہ نہ ہو' اور جب سورج عین نصف النہار پر ہو اس وقت سجدہ نہ ہو۔ دنیا میں جس چیز کی سب سے زیادہ پرستش کی گئی ہے وہ سورج ہے۔ شماس دیوتا' آمون را وغیرہ کے ناموں سے ہر جگہ سورج کی پرستش کی گئی ہے۔ کلدانیا میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی وہاں سب سے بڑا دیوتا سورج تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عالَمِ مادّی اور عالَمِ اسباب میں ہمارے سلسلۂ حیات کی ضروریات کا جو سائیکل چل رہا ہے' اس میں سورج کو بڑی ہی اہم (crucial) حیثیت حاصل ہے۔ تو جن کی نگاہ اس عالَمِ مادّی اور اسباب میں اُلجھ کر رہ گئی' اس سے آگے گزر نہ سکی وہ مسبّب الاَسباب تک نہ پہنچ سکے۔ وہ جو اقبال نے کہا ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں!

کبھی انسان کی نگاہ عالم اسباب ہی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ عالَمِ اسباب میں جو اہم ترین چیز نظر آئے گی وہ سورج ہے۔ چنانچہ سورج کو اس لیے پوجا گیا کہ جذبۂ تشکّر لازماً جذبۂ عبادت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ تشکّر کسی ایسی بالاتر ہستی کا ہے' جس کی آپ کوئی خدمت بجا نہیں لا سکتے' جس کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے تو یہ جذبۂ تشکر پرستش کا رخ اختیار کر سکتا ہے۔

عبادت: کُلّی اور ہمہ وقتی اطاعت

قرآن کریم کی سورۃ الذاریات کی یہ آیات ملاحظہ کیجیے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿٥٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿٥٨﴾﴾

”اور مَیں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔ مَیں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا‘ اور نہ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کھلائیں‘ پلائیں۔ یقیناً اللہ ہی سب کو رزق دینے والا‘ قوت والا‘ زبردست ہے۔“

مجھے اپنے بندوں سے نہ کوئی رزق چاہیے‘ نہ مجھے یہ احتیاج ہے کہ وہ مجھے کھلائیں پلائیں۔ اللہ تو خود ہی رزّاق ہے‘ بڑی طاقت والا‘ بڑی قدرت والا‘ وہ تو ان چیزوں سے ماورا ہے۔ اُس کی بندگی یہ ہوگی کہ اپنے آپ کو اُس کے سامنے جھکاؤ‘ اُس کی اطاعت قبول کرو‘ زندگی میں اُس کے بندے بن کر رہو‘ اُس کی فرماں برداری اختیار کرو۔ یہ بات البتہ ذہن میں رہے کہ یہ فرماں برداری نہ جزوی ہوسکتی ہے اور نہ جز وقتی۔

آج کل ”آجر اور مستاجر کے باہمی تعلق“ (Employer-employee relationship) کا ہمارا جو تصوّر ہے‘ اس کی وجہ سے وہ آقا اور بندے والا تصور ذہنوں سے نکل چکا ہے‘ اس لیے کہ ہمیں اس کی کوئی مثال سامنے نظر نہیں آتی۔ اگر کوئی شخص ایک دن کی مزدوری پر کام کر رہا ہے‘ وہ آٹھ گھنٹے کام کرے گا اور وہی کام کرے گا جس کا آپ کے ساتھ معاہدہ طے پایا ہے۔ شام کو اجرت لے کر وہ فارغ ہے۔ آپ اُس کے آقا اور مالک نہیں ہیں۔ کوئی ملازم ہے تو جو اُس کے فرائض ہیں وہ ادا کرے گا۔ کوئی کلرک ہے تو آپ اس سے جھاڑو نہیں دلوا سکتے۔ ایک اور شخص جس سے آپ نے ٹھیکے (contract) پر کوئی معاملہ طے کیا ہے تو آپ اس سے کوئی اور مطالبہ نہیں کر سکتے۔ عبدیت کو جزوی یا جز وقتی ملازمت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جو عبدیت ہے یہ کُلّی اور ہمہ وقتی ہے۔ بندہ تو ہر وقت بندہ ہے‘ اسے ہر وقت ہر حکم ماننا ہے‘ کسی حکم کو وہ لوٹا نہیں سکتا‘ اس لیے کہ یہاں کوئی contract نہیں ہے‘ یہ کوئی معاہدے کی بنیاد پر کام نہیں ہو رہا‘ بلکہ یہ بندگی ہے‘ جو جز وقتی یا جزوی نہیں ہوسکتی۔

اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ کرم اور رحمت ہے کہ اُس نے استثناء (exception) رکھا ہے کہ کہیں بھول جاؤ‘ کہیں خطا ہو جائے تو پریشانی اور پشیمانی کے ساتھ لوٹ آؤ‘ میں معاف کر دوں گا۔ یہ اُس کا کرم ہے‘ وگرنہ واقعہ یہ ہے کہ وہ تعلق اتنا نازک ہے کہ آپ نے

اس کے ایک حکم سے سرتابی کی تو وہ تعلق ختم ہو گیا' لیکن اُس نے ہماری کمزوریوں کو جو ہماری پیدائش میں موجود ہیں'ان کا لحاظ کیا ہے۔ اُسی نے یہ فرمایا ہے: ﴿وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا ﴿۲۸﴾﴾ (النساء) ''اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

انسان میں نسیان بھی ہے' بھول بھی جاتا ہے۔ چنانچہ دعا سکھائی گئی:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا﴾ (البقرة:۲۸۶)

اے ہمارے پروردگار! اگر بغیر ارادے کے ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہو' ہم کہیں بھول گئے ہوں' چوک گئے ہوں' کہیں ہم جذبات کی رو میں بہ گئے ہوں تو ہم سے درگزر فرمانا' ہمارا مواخذہ نہ کرنا! انسان جیسے ہی متنبہ ہو جائے کہ مجھ سے خطا ہوئی ہے' مَیں مقامِ بندگی کے نامناسب روش اختیار کر بیٹھا ہوں' وہ لوٹے گا تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ البتہ بندگی اپنے مفہوم کے اعتبار سے نہ جزوی ہو سکتی ہے اور نہ جز وقتی ہو سکتی ہے' بلکہ وہ کُلّی اور ہمہ وقتی اطاعت ہوگی' اور محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہوگی۔ اب اگر یہ کیفیت ہے اور انسان کہے ''اِیَّاكَ نَعۡبُدُ'' تو وہ سچ کہہ رہا ہے' اور اگر یہ کیفیت نہیں ہے اور وہ کہہ رہا ہے: ''اِیَّاكَ نَعۡبُدُ'' تو اُس نے اظہارِ حال کے اعتبار سے جھوٹ کہا ہے۔ وہ اپنے قول میں صادق نہیں ہے' وہ ایسی بات کہہ رہا ہے جس پر وہ پورا نہیں اُتر رہا۔ اس اعتبار سے یہ چونکا دینے والی چیز ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کو اقبال نے کہا ہے۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

''جب مَیں کہتا ہوں کہ مَیں مسلمان ہوں تو لرز اٹھتا ہوں' اس لیے کہ میں کلمہ لا اِلٰہ اِلا اللہ کے لوازم اور تقاضوں کو جانتا ہوں۔''

یہاں سے وہ بات آگے چلے گی تو پھر اس کا تعلق جڑتا ہے ''اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ'' سے' کہ کتنی بڑی بات مَیں کہہ رہا ہوں' مجھ پر لرزہ طاری ہو رہا ہے۔ پروردگار! مَیں اس میں تیری مدد کا محتاج ہوں' تُو ہی اعانت فرمائے گا' تُو ہی مدد فرمائے گا تو مَیں اپنی بات پر پورا اُتر سکوں گا۔ اپنے زورِ بازو پر اتنی بڑی بات زبان سے نہیں نکال رہا' بلکہ یہ بھی درحقیقت

اللہ کے حوالے کر دینے والی بات ہے۔ اُسی کا ایک پہلو ہے کہ مَیں نے ارادہ کیا ہے‘ عزم کیا ہے۔ مَیں تجھ سے عہد کر رہا ہوں لیکن جب تک تیری تائید اور نصرت شاملِ حال نہ ہو گی‘ اس عہد پر پورا اُترنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کی جو مسنون دعائیں ہیں‘ نماز کے بعد کے کچھ اذکارِ مسنونہ ہیں‘ ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اَعِنِّي عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ)) (۳۲)

’’اے اللہ! میری مدد فرما اس پر کہ مَیں تیرا ذکر کروں‘ تیرا شکر ادا کر سکوں‘ اور باحسن وجوہ تیری بندگی کر سکوں۔‘‘ (آمین یاربّ العالمین!)

(جاری ہے)

حواشی

(۳۰) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب الانتہاء عن المعاصی‘ ح ۶۴۸۳ وصحیح مسلم‘ کتاب الفضائل‘ باب شفقتہ ﷺ علی امتہ‘ ح ۵۹۵۷۔

(۳۱) ملاحظہ ہو: حقیقت واقسامِ شرک‘ تالیف ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

(۳۲) مسند احمد: ۵ /۲۴۴‘ وسنن ابی داؤد: ۱۳۶۱‘ وسنن النسائی: ۱۳۰۴۔ امام البانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ❁❁

بقیہ: اسماءُ اللہ الحُسنٰی

ایک مسلمان کو یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے تقدس کے معنی صرف اس قدر نہیں ہیں کہ وہ لوازم بشریہ سے پاک و برتر ہے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدوسیت یہ ہے کہ نوری ملائکہ اور پاک روح میں جو بھی ممکنہ نقائص ہو سکتے ہیں‘ وہ بھی اُس کی ذات میں نہیں۔ مثلاً روح اور ملائکہ کا مخلوق ہونا‘ ان کے آغاز کی ابتدا نیز ان کے انجام کی غایت۔ وہ ذاتِ سبحانی ہر ایسے نقص سے پاک اور ان سب سے بالاتر ہے۔

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ﴾ (الحشر: ۲۳)

’’وہی اللہ ہے (کہ) جس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ شہنشاہ‘ نہایت پاک۔‘‘

(جاری ہے)

یہود‘ قرآن اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ ‘ بانی تنظیم اسلامی

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اَعُوْذ باللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾﴾ (البقرۃ)

﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾﴾ (البقرۃ)

رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْ لِی أَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِی یَفْقَهُوا قَوْلِی....

آج کے موضوع پر اس سے قبل بھی مختلف حوالوں سے بات ہو چکی ہے۔ کم از کم میرے بچپن یا نوجوانی تک تو معاملہ یہ تھا کہ لفظ ''یہودی'' کو ہم گالی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہودی کس بلا کا نام ہے! ہماری زبان میں لفظ سُوَر بولنا بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا‘ حالانکہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ اسی طرح یہودی لفظ بھی زبان پر لاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ آج وہی یہودی دنیا میں ایک بہت بڑی طاقت بن چکا ہے۔ اس وقت عالمی سیاست کے پیچھے درحقیقت کچھ اور ہے جبکہ سامنے کچھ اور نظر آ رہا ہے۔ اصل مسئلہ یہودیت کا ہے۔ اب لوگوں میں بہت آگاہی ہو گئی ہے کہ یہ ایک قوم اور نسل ہے۔ شروع سے ہم پڑھتے آئے ہیں کہ سورۃ الفاتحہ میں جن پر اللہ کا غضب نازل ہونے کا ذکر ہے‘ وہ یہودی تھے۔ میرے بچپن اور جوانی تک ان کی کوئی

دُنیاوی حیثیت نہیں تھی۔ یہ تو ۱۹۴۸ء میں ''اسرائیل'' کے نام سے ایک ملک وجود میں آیا۔ اس ملک کے حوالے سے تب لوگ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ ایک یہودی ملک ہے۔ آج از روئے قرآن سوچیں کہ یہ کون ہیں! ان کا معاملہ کیا ہے؟ ہمارے ساتھ ان کی نسبت کیا ہے؟ قرآن مجید میں ان کا ذکر کن حوالوں سے کیا گیا ہے؟

یہود یا بنی اسرائیل ہم سے پہلے کی اُمّتِ مُسلمہ تھے۔ جیسے ہم سیدنا محمد ﷺ کے اُمتی ہیں، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُمتی ہیں۔ جیسے حضرت محمد ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام سے ایک نسل چلی، جن کا لقب ''اسرائیل'' تھا۔ عبرانی زبان میں اس کا مطلب ہے: عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جو بنی اسرائیل (اسرائیل کے بیٹے) کہلائے۔ ان سے جو قومیں اُبھریں، لاکھوں لوگ پیدا ہوئے وہ سب کے سب بنواسرائیل کہلائے۔ نسلی قومیت کے اعتبار سے یہ اگرچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک موجود تھے لیکن ان کی حیثیت ایک اُمّت کی نہیں بلکہ قوم کی تھی۔ اخلاقی اور عملی اعتبار سے ان میں بُرائیاں پیدا ہوگئی تھیں، البتہ توحید ان کے اندر بہت اچھی طرح رچی بسی تھی۔ یہ بُت پرستی سے ہمیشہ اجتناب کرتے رہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے ان کو ایک اُمّت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اُمّت کتاب کی بنیاد پر بنتی ہے، چنانچہ جب ان کو تورات عطا ہوئی تب یہ اُمّت بن گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے ۱۴۰۰ سال قبل انہیں تورات عطا کی گئی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾﴾ (السجدۃ)

''اور ہم نے موسیٰؑ کو بھی کتاب عطا کی تھی تو آپ کسی شک میں نہ رہیے اُس کی ملاقات سے اور اس (تورات) کو ہم نے بنا دیا تھا راہنمائی بنی اسرائیل کے لیے۔''

یہیں سے یہ فرق نوٹ کر لیں کہ قرآن پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت بن کر آیا ہے جبکہ

تورات صرف بنی اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ تھی۔ بہرحال یہ قوم ایک اُمّتِ مُسلمہ کی حیثیت سے قائم رہی۔ ان کو اپنے بارے میں زعم ہوگیا تھا کہ ہم اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ واقعی ان پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا تھا' اس میں کوئی شک نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کو فرعونیوں سے نجات دلائی۔ مصر سے نکلنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بڑے معجزے دکھائے گئے۔ اس کے بعد ان کو راستہ دینے کے لیے عصا کی ضرب سے سمندر پھٹ گیا۔ عصائے موسوی سے ایک چٹان سے بارہ چشمے بہ نکلے۔ ہر قبیلے کا علیحدہ چشمہ تاکہ آپس میں لڑائی نہ ہو۔ ہر قوم نے اپنا گھاٹ معیّن کرلیا۔ صحرائے سینا میں ان کو دھوپ کی سختی سے بچایا تو ان کے اوپر مسلسل ابر چل رہا تھا۔ بھوک لگی تو معجزانہ طریقے سے اللہ نے ان کو مَنّ وسلویٰ عطا کیا۔ پھر اللہ نے ان کو کتاب دی۔ کوہِ طور صحرائے سینا میں ہے۔ چالیس دن کا چِلّہ کروا کر جس میں آپؑ مسلسل روزہ سے تھے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی۔ دس احکامات دیے جو کہ پتھر کی سِلوں کے اوپر کندہ تھے۔ قرآن پاک میں دو مرتبہ ان کا تفصیل سے ذکر آیا ہے جبکہ ایک حدیثِ نبویؐ ہے' جس کے راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں:

((لَتَرْكَبُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ وَبَاعًا بِبَاعٍ، حَتّٰى لَوْ اَنَّ اَحَدَهُمْ دَخَلَ جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمْ، وَحَتّٰى لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ جَامَعَ أُمَّهُ لَفَعَلْتُم))(السلسلة الصحيحة للالبانی' ومجمع الزوائد)

''تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کی پیروی کرو گے بالشت در بالشت' ہاتھ در ہاتھ اور باع (دونوں ہاتھوں کی لمبائی) در باع' یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہوگا تو تم بھی ضرور گھسو گے۔ اور اگر ان میں سے کسی بدبخت نے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کی ہوگی تو تم بھی ایسا ضرور کرو گے۔''

امام بخاری و مسلم کی نقل کردہ روایت کے آخر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ سوال بھی درج ہے کہ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی؟ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا پہلے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فَمَنْ؟ ''تو اور کون مراد ہیں؟''

یعنی تم سے پہلے کی اُمّت یہود و نصاریٰ ہی تو ہیں۔

سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل سے خطاب پر مشتمل جو مسلسل دس رکوع آئے ہیں‘ ان میں یہود کے عقیدے کی گمراہیوں‘ ان کے عمل کی گمراہیوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور ہمیں آئینہ دکھایا گیا ہے کہ تم نے بھی ایسا کرنا ہے‘ اس سے بچو۔ یہود کو زعم ہو گیا تھا کہ ہم تو اللہ کے چہیتے اور لاڈلے ہیں۔ ہمیں تو آگ چھو ہی نہیں سکتی‘ اگر چھوئے گی بھی تو چند روز کے لیے۔ مسلمانوں کو بھی زعم ہو گیا ہے کہ ہم اُمّتِ محمدیؐ ہیں‘ جہنم میں اگر جائیں گے تو تھوڑی دیر کے بعد ہمیں نکال لیا جائے گا۔ جبکہ اللہ نے نہ تورات میں ایسا وعدہ کیا تھا اور نہ قرآن میں یہ وعدہ ہے۔ اگر دل میں حقیقی ایمان ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر گناہوں کا پلڑا بھاری ہوا تو جہنم میں داخل کرنے کے بعد سزا دے کر نکال لیا جائے گا‘ لیکن اگر محض نام کا مسلمان ہے اور دل میں ایمان کی رمق بھی موجود نہیں ہے تو ایسا کوئی وعدہ نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں سے نہیں بلکہ اہلِ ایمان سے وعدہ ہے۔ اس وقت میں تفصیل نہیں جا سکتا۔ اس کی بہترین مثال سورۃ الحجرات کی یہ آیت ہے:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ﴾ (الحجرات:۱۴)

’’یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے: تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو‘ بلکہ تم یوں کہو کہ ہم مسلمان (اطاعت گزار) ہو گئے ہیں اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔‘‘

زبان کے اقرار سے ایک انسان مسلمان تو بن گیا لیکن مومن بنتا تب ہوتا ہے جب اسے دلی یقین بھی حاصل ہو جائے‘ ورنہ نہیں۔

چنانچہ یہ گمراہی بھی ہم میں پیدا ہوئی کہ ہم اللہ کے حبیبِ مکرم ﷺ کے پیروکار ہیں اور شفاعت پر ہمارا لازماً حق ہے۔ متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے لوگ آپ ﷺ کے پیروکار نہیں ہیں۔ جیسے یہ حدیثِ مبارکہ ہے:

((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) (صحیح البخاری)

’’جسے میری سُنّت پسند نہیں ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘

یہ کوئی نسلی معاملہ نہیں بلکہ عقیدے اور ایمان کا معاملہ ہے۔ اللہ کے سارے وعدے ایمان کی بنیاد پر ہیں۔ بہرحال جو برائیاں یہود میں آئیں وہ ہم میں بھی در آئیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا‘ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما اس کے راوی ہیں:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))

(سنن الترمذی)

’’میری اُمّت پر بھی مصائب وحوادث اسی طرح واقع ہوں گے جیسے بنی اسرائیل پر ہوئے‘ بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔‘‘

یہ تشبیہ انتہائی فصیح و بلیغ ہے۔ ان دونوں اُمتوں میں دو ہزار سال کا فصل ہے۔ ۱۴۰۰ قبل مسیح میں تورات نازل کی گئی جبکہ ۶۰۰ ء کے بعد حضور ﷺ پر قرآن نازل ہوا۔ یہ کُل ملا کر ۲۰۰۰ سال ہو گئے۔ فاصلہ تو بہت ہو گیا مگر جو اُن پر بیتا بعینہٖ وہی ہم پر بیت رہا ہے۔ اس پر میں نے ۱۹۹۳ء میں اعتکاف کی حالت میں چند مضامین تحریر کیے تھے جو میری اس کتاب میں شامل ہیں: ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل‘ اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری۔‘‘ تاریخی تسلسل کے بغیر تو چلنا ناممکن ہے۔ کہاں سے چلے تھے؟ کدھر پہنچے ہیں؟ ان میں کون کون سے مقامات آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے عروج و زوال کے چار اَدوار کا ذکر کیا ہے:

﴿وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۲ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۳ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۴ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا

جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور ہم نے اُسے ہدایت بنایا بنی اسرائیل کے لیے کہ تم مت بناؤ میرے سوا کسی کو کارساز۔ اے اُن لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے سوار کرایا تھا نوحؑ کے ساتھ‘ یقیناً وہ ہمارا بہت ہی شکر گزار بندہ تھا۔ اور ہم نے متنبہ کر دیا تھا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے اور بہت بڑی سرکشی کرو گے۔ پھر جب ان دونوں میں سے پہلے وعدے کا وقت آ گیا تو ہم نے تم پر مسلّط کر دیے اپنے سخت جنگجو بندے تو وہ تمہاری آبادیوں میں گھس گئے‘ اور (یوں ہمارا) جو وعدہ تھا وہ پورا ہو کر رہا۔ پھر ہم نے تمہاری باری لوٹائی ان پر اور ہم نے مدد کی تمہاری مال و دولت اور بیٹوں کے ذریعے سے اور بنا دیا تمہیں کثیر تعداد (والی قوم)۔ اگر تم نے کوئی بھلائی کی تو خود اپنے ہی لیے کی‘ اور اگر کوئی برائی کمائی تو وہ بھی اپنے ہی لیے کمائی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا‘ تا کہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور وہ داخل ہو جائیں مسجد میں جیسے کہ داخل ہوئے تھے پہلی مرتبہ‘ اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیں (ہر اُس شے کو) جس کے اوپر بھی انہیں قبضہ حاصل ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے‘ اور اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی کچھ کریں گے۔ اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔‘‘

سیدنا محمد ﷺ کی بعثت تک یہ چار دور گزر چکے تھے: ایک عروج‘ ایک زوال پھر ایک عروج‘ ایک زوال۔ پہلا عروج ایک طرح سے ان کی خلافتِ راشدہ کا دور کہلائے گا‘ جیسے ہمارے ہاں خلافتِ راشدہ کو ایک زریں دور کہا جاتا ہے۔ اس میں تین متفق علیہ خلافتیں ہیں حضرت ابوبکر‘ حضرت عمر‘ حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی‘ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اختلاف ہو گیا تھا۔ پورا عالمِ اسلام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں نہیں تھا‘ شام اور مصر باہر رہے تھے۔ اسی طرح بنی اسرائیل کی تاریخ میں تین بادشاہوں کا زمانہ

اس دور کا عہدِ زریں کہلاتا ہے: حضرت طالوت‘ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بیٹوں نے مملکت کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ اسرائیل کے نام سے شمالی مملکت بنی جبکہ یہودا کے نام سے جنوبی مملکت بنی۔ اسرائیل کا پایہ تخت سامر یہ تھا جبکہ یہودا کا یروشلم۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یروشلم میں مسجد تعمیر کی تھی لیکن یہ لوگ اسے ٹیمپل (ہیکل سلیمانی) کہتے ہیں۔ یہ عروج کا پہلا دور تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد زوال کا آغاز ہو گیا۔ ان کے اندر اعتقادی‘ اخلاقی اور عملی گمراہیاں در آئیں۔ نفس پرستی‘ شہوت پرستی اور دولت پرستی پیدا ہوئیں‘ البتہ توحید برقرار رہی۔ پھر اللہ نے ان پر عذاب کے کوڑے برسائے۔

ان کی فضیلت پر مشتمل آیات سورۃ البقرۃ میں دو مرتبہ وارد ہوئی ہیں۔ چھٹے رکوع کی پہلی آیت (۴۷) اور پندرھویں رکوع کی پہلی آیت (۱۲۲) کے الفاظ یکساں ہیں:

﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ۝﴾

’’اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا تھا اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت عطا کی تھی۔‘‘

یہ قرآن کہہ رہا ہے‘ تورات نہیں۔ البتہ پھر قرآن یہ بھی کہتا ہے:

﴿وَضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ ٭ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ؕ﴾

(البقرۃ:۶۱)

’’ان پر ذِلّت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کی طرف سے عذاب لے کر لوٹے۔‘‘

یہاں ایک نکتہ ہے کہ وہی اُمّت جو پہلے محبوب ہوتی ہے‘ پھر مغضوب کیوں ہو جاتی ہے!

اللہ کا پہلا عذاب ان پر ۷۰۰ قبل مسیح میں آیا جب آشوریوں نے شمال سے آ کر حملہ کیا اور ان کی مملکت ختم کر دی۔ سو سال بعد مشرق سے بابل (موجودہ عراق) کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے عذاب کا کوڑا برسایا۔ اس نے چھ لاکھ یہودی قتل

کیے اور چھ لاکھ کو قیدی بنا کر عراق لے گیا جبکہ یروشلم کی کل آبادی بارہ لاکھ تھی۔ یروشلم کی ایک اینٹ بھی سلامت نہیں رہی۔ ہیکلِ سلیمانی گرا دیا گیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب حضرت عزیر علیہ السلام نے یروشلم کو دیکھا تو ان کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے: ﴿ اَنّٰی یُحۡیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ۚ ﴾ ''اللہ اس بستی کو اس کے مردہ اور برباد ہو جانے کے بعد کس طرح زندہ اور آباد کرے گا؟'' وہ اللہ کے نبی تھے۔ تباہی اس درجے کی تھی کہ ہیکل برباد ہو گیا تھا اور ایک بھی ذی نفس باقی نہیں رہا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو موت اور دوبارہ زندگی کا مشاہدہ کرایا۔ ﴿ فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ؕ ﴾ (البقرہ: ۲۵۹) ''اللہ نے سو برس تک ان پر موت طاری کر دی' پھر ان کو اٹھایا۔''

اس زوال کی انتہا ۵۸۷ قبل مسیح میں ہوئی جب ہیکلِ سلیمانی اور یروشلم کو ختم کر دیا گیا اور یہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر لے جائے گئے۔ عراق میں یہ ڈیڑھ سو برس تک ایسی حالت میں رہے۔ پھر اللہ نے ان میں حضرت عزیر علیہ السلام کو مبعوث کیا جنہوں نے ان کے ایمان کی تجدید کی اور کہا کہ اللہ کی جناب میں توبہ کرو' اپنے عمل اور اخلاق درست کرو' اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا۔ اس کے بعد سائرس (یا کیخورس) جو ایران کے بادشاہ تھے اور بہت ہی نیک آدمی تھے' انہوں نے عراق پر حملہ کیا اور وہاں کی سلطنت کو ختم کر کے بنی اسرائیل کو کہا کہ تم جاؤ اور اپنا ملک آباد کر لو۔ یہی بادشاہ ''ذوالقرنین'' کہلاتے ہیں جو یہودیوں کے محسنِ اعظم ہیں۔ اسی لیے یہودیوں نے قریش سے کہا تھا کہ اگر محمدؐ نبی ہیں تو بتائیں ذوالقرنین کون ہیں!

بنی اسرائیل کے عروج کا دوسرا دور آیا تو انہوں نے ہیکل سلیمانی کو آباد کیا۔ دوبارہ اسی عیش پرستی' شہوت پرستی اور دولت پرستی میں مبتلا ہو گئے تو پھر عذاب آیا۔ یہ دوسرا زوال تھا۔ یونانیوں نے پہلا حملہ کیا اور سکندر اعظم انہیں روندتا ہوا گزر گیا۔ پھر اس کے جرنیل سلوکس کی حکومت قائم ہوئی۔ وہ ہٹے تو رومن آ گئے۔ انہوں نے ان کو پسپا کیا۔ یہاں تک کہ ۷۰ ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ گئے۔ اب وہاں رومن کا اقتدار تھا۔ رومن گورنر کے حکم سے بقول ان کے حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا گیا' اس لیے کہ یہودیوں نے

کہا تھا کہ یہ مرتد اور واجب القتل ہے۔ اللہ نے ان کو زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا‘ اگرچہ یہودیوں نے تو ان کو اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا دیا تھا۔ بہرحال ایک رومن جرنیل ٹائٹس کے ہاتھوں ۷۰ عیسوی میں دوبارہ یروشلم اور ہیکلِ سلیمانی مسمار ہوا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیا گیا۔ اس تاریخ سے ان کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے یہ Exodus کہتے ہیں‘ یعنی دنیا میں ہمارے منتشر ہونے کا دور۔ کچھ یہودی ایشیا کے مختلف علاقوں میں آ گئے‘ کچھ یورپ چلے گئے‘ کچھ امریکہ میں چلے گئے‘ کوئی کہیں اور چلا گیا۔ یہ وقت حضورﷺ کی ولادت سے ۵۰۰ برس قبل کا تھا۔ چنانچہ حضورﷺ کی ولادت سے ۵۰۰ برس پہلے جو ان کا خروج شروع ہوا تھا‘ وہ ۱۹۱۷ء تک چلا۔ یہ ۱۸۰۰ برس ان کے ایسے گزرے ہیں کہ ان کا فلسطین میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ یہود کی تاریخ کا اجمالی تجزیہ ہے۔

مسلمانوں کا پہلا دورِ عروج عربوں کی زیر قیادت شروع ہوا۔ خلافتِ راشدہ‘ بنواُمیہ اور بنوعباس۔ دنیا میں ہر طرف ان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس کے بعد پہلے شمال سے زوال آیا۔ ۱۰۹۹ء میں یروشلم مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ یورپ کے عیسائی ۸۸ برس تک اس پر قابض رہے۔ ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے اس کا بڑا حصہ واپس لیا۔ اس کے بعد مشرق سے تاتاری حملہ آور ہوئے۔ کروڑوں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ انہوں نے خراسان کا پورا وسیع وعریض علاقہ‘ پورا افغانستان اور ایران تہس نہس کر دیا۔ تاتاریوں کی دہشت کا عالم یہ ہو گیا تھا کہ اگر ایک تاتاری دس بیس مسلمانوں کے پاس آ کر کہتا کہ یہاں پر کھڑے رہو‘ میں گھر سے تلوار لا کر تمہیں قتل کروں گا تو وہ مسلمان دہشت زدہ ہو کر کھڑے رہتے تھے اور وہ آ کر ان کو ذبح کرتا تھا۔ یہ ہے وہ عذاب جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہود کے حوالے سے کیا ہے:

﴿وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ۚ﴾ (البقرۃ:۶۱)

’’اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی تھوپ دی گئی۔‘‘

قتل ہو جانا اور ہے جبکہ دہشت زدہ ہو جانا اور شے ہے۔ مسکنت دراصل کمزوری

اور کم ہمتی ہے۔ کمزور لوگوں کی وجہ سے قوم کے اندر مقابلے کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ دہشت تھی جو مسلمانوں پر طاری ہو گئی۔ ۱۲۵۸ء میں بنوعباس کے آخری خلیفہ کو محل سے نکالا گیا اور تاتاریوں نے اسے جانور کی کھال میں لپیٹ کر اس پر گھوڑے دوڑا دیے۔ اس خلیفہ کا نام مستعصم باللہ تھا۔ اس پر شیخ سعدی نے یہ نوحہ کہا تھا: ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المؤمنیں!

(آسماں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ امیر المؤمنین مستعصم باللہ کی مملکت کے زوال پر زمین پر خون کی بارش برسائے۔)

ہمارا دوسرا دورِ عروج انہی تاتاریوں کی نسل سے آیا ہے۔ جنہوں نے کروڑوں مسلمانوں کو قتل کیا تھا' اللہ نے ان کو اسلام کی توفیق عطا کر دی اور وہ خود مسلمان ہو گئے۔ ان میں ترکانِ صفوی بھی تھے اور ترکانِ عثمانی بھی۔ خلافتِ عثمانی ان کے پاس آ گئی۔ یہ عرب نہیں بلکہ اصل میں تاتاری تھے۔ دنیا میں ان کی عظیم سلطنت قائم ہوئی۔ پھر ہمارا حال وہی ہوا جو سابقہ اقوام کا ہوتا رہا۔ عیاشیاں اور دنیا پرستی ہم پر غالب آ گئیں۔ چنانچہ ہم پر پھر عذاب آیا۔ کہیں انگریز آ گئے' کہیں فرانسیسی تو کہیں ہسپانوی آ گئے۔ پورا عالمِ اسلام یورپ کی نوآبادیاں بن گیا۔ پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئی اور اس کا نام ونشان مٹ گیا۔ یہ تین براعظموں پر محیط تھی: پورا شمالی افریقہ' پورا مغربی ایشیا اور مغربی یورپ۔ ایک عظیم مملکت اپنا وجود کھو بیٹھی اور اس کی جگہ چھوٹا سا ملک ترکی باقی رہ گیا۔ یہ تمام اس عظیم سلطنت کی باقیاتِ صالحات ہیں۔ یہ بوسنیا ہے' یہ فلاں ہے اور وہ فلاں ہے۔ اس دور کے بچے کھچے اثرات بلغاریہ اور یوگوسلاویہ میں ہیں۔ یہ چار دور ہم پر مکمل ہو گئے تھے۔

پانچواں دور پچھلی صدی کے آغاز میں شروع ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں صہیونیت (Zionism) کی ایک تحریک شروع ہوئی۔ انہوں نے اپنے پروٹوکول متعین کیے۔ بیس برس کے اندر اندر استارسوخ حاصل کر لیا کہ اس وقت کی سپر پاور اور عظیم سلطنت برطانیہ

کے ذریعے سند مل گئی کہ یہودی فلسطین میں واپس آ کر آباد ہو سکتے ہیں۔ وہاں یہ جائز اور ناجائز دونوں طریقوں سے آئے۔ عربوں کی جائدادیں خریدیں۔ ان کے گھر خریدے۔ ان کے کھیت خریدے۔ یہ اس طرح سودا کرتے تھے کہ بھئی تمہارے گھر کی قیمت دو لاکھ ہے ہم تین لاکھ دیتے ہیں‘ تم کل تک یہاں سے نکل جاؤ۔ پیسہ بے تحاشا تھا۔ بینکنگ کے سلسلے میں انہوں نے پورے یورپ کو جکڑا ہوا تھا۔ اس کے ۳۱ برس بعد یعنی ۱۹۴۸ء میں اسرائیل قائم ہو گیا۔ اب یہ عالمی سطح پر آ گیا۔ اپنی ایک چھوٹی سی حکومت بنائی۔ یہ ہے وہ معاملہ جس سے ہم دوچار ہیں۔ ایک وقت تھا جب مولانا الطاف حسین حالی نے کہا تھا: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے!
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

اس کے بعد تحریکیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان میں جماعت اسلامی‘ ایران میں فدائین‘ مصر میں اخوان المسلمون اور ترکی میں نورسی تحریک۔ میں اس خوش فہمی میں تھا کہ ہم زوال کے نقطے تک پہنچ چکے ہیں‘ اب ہمارا عروج دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ میرا اندازہ تھا کہ اب عروج کا وقت آ گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہم بھی آزاد ہو گئے۔ ہندوستان میں سے دو ٹکڑے مسلمانوں کو ملے: مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔ انڈونیشیا آزاد ہو گیا اور ملائیشیا بھی۔ عرب ممالک آہستہ آہستہ آزاد ہوتے چلے گئے۔ اسی دوران ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے عربوں کو شرم ناک شکست دی۔ اسرائیل جب آزاد ہوا تو ایک چھوٹی سی ریاست تھا مگر پھر اس نے مصر سے جزیرہ نمائے سینا کا علاقہ لے لیا۔ شام سے گولان کی پہاڑیاں لے لیں۔ اردن سے دریائے اردن کا مغربی کنارہ چھین لیا۔ بیت المقدس اس وقت تقسیم (divided) تھا‘ آدھا یہودیوں اور آدھا مسلمانوں کے پاس تھا جبکہ مسجد اقصیٰ پوری طرح مسلمانوں کے زیر انتظام تھی لیکن ۱۹۶۷ء میں پورا یروشلم ان کے قبضے میں چلا گیا۔ عربوں کو بدترین شکست ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں اتنی ہی شرم ناک شکست پاکستان

کو ہوئی۔ پچانوے ہزار کڑیل جوان ہندو کے قیدی بنے۔اس کے بعد وہ لہر آئی جب لاہور میں مسلم ممالک کی سربراہی کانفرنس ہوئی۔

افسوس کی بات ہے کہ ۱۹۷۴ء کی میری رائے بدل گئی ہے۔ ہمارے زوال کا ابھی آخری نقطہ نہیں آیا۔ابھی بہت بڑی تباہی آ رہی ہے۔ وہ نقطہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی محبوب اُمّت پر عذاب کیوں بھیجتا ہے؟ بنی اسرائیل کو یہ زعم ہو گیا تھا کہ ہم اللہ کے لاڈلے بیٹے ہیں: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط﴾ (المائدۃ:۱۸) ''ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے بڑے چہیتے ہیں۔'' قرآن تصدیق کرتا ہے کہ ہم نے ان کو علم کی وجہ سے چنا اور پسند کیا تھا: ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾﴾ (الدخان) ''اور ہم نے علم رکھنے کے باوجود اُن (بنی اسرائیل) کو اقوامِ عالَم پر ترجیح دی تھی۔'' ایسی قوم پر ایسے ایسے عذاب کیوں آئے؟ جس قوم کے پاس اللہ کی کتاب ہو، شریعت ہو وہ اللہ کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اگر وہ شریعت اور کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینکتی ہے تو وہ کافروں سے بڑھ کر مجرم ہے۔ ہمارا ابھی یہی حال ہو گیا ہے۔ شریعتِ محمدیؐ کے عامل، حاملِ قرآن۔ علامہ اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' پڑھیں تو معلوم ہو گا کہ آج کا بندہ پیسے کا پرستار ہے۔ اپنے آپ کو عبدالرحمٰن کہتا ہے جبکہ حقیقت میں عبدالدینار و عبدالدرہم ہے۔ بات صحیح ہے۔ جو عذاب اُن پر آیا، وہی عذاب آج ہم پر ہے۔ وہی سیلاب کا عذاب ہم پر آ رہا ہے۔ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا لفظ پہلی مرتبہ امریکی صدر بش سینئر نے استعمال کیا۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ذریعے پوری دنیا کے کاروبار کو کنٹرول میں لیا۔اس کے بعد ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن پوری دنیا کی زراعت کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے قائم کی۔ دنیا میں کوئی ملک اپنا بیج پیدا نہیں کر سکے گا، بیج ہم سے لینا ہو گا۔ وہ ایسا بیج دیں گے جو ''خصی'' ہو گا۔ ایک فصل کے بعد دوسری فصل نہیں اُگے گی۔ یہ جو دجالی فتنہ بڑی تیزی سے آ رہا ہے، اس کا ہدف عالَمِ اسلام ہے۔

میں نے تاتاریوں کی دہشت کا ذکر کیا تھا۔ بعینہٖ آج وہی حال ہمارا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایران کے بعد عراق اور پھر پاکستان ہدف ہو سکتا ہے۔ اندھوں کو بھی نظر آ رہا

ہے۔ جنرل مشرف چاہے کتنا ہی بش کے نام کی تسبیح پڑھتے رہیں مگر پاکستان کا ایٹمی پروگرام امریکہ کو کھٹک رہا ہے۔ عراق پر حملہ ہونا ہے۔ اب ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ صدر صدام نے شام کو کیمیائی ہتھیار دے دیے ہیں' لہٰذا شام پر بھی حملہ ہونا چاہیے۔ سوڈان اور لیبیا تو ان کے پہلے ہی حریف ہیں۔ سعودی عرب ان کا بغل بچہ ہے۔ آلِ سعود پہلے برطانیہ کے وظیفہ خوار تھے جبکہ ان کے پاس کچھ نہیں تھا' تیل کا وجود نہیں تھا۔ شاہی خاندان کو وظیفہ ملتا تھا جس سے وہ اپنا کام چلاتے تھے۔ اب یہ امریکہ کے گھڑے کی مچھلی ہیں۔ امریکہ کو یہ تکلیف ہے کہ ان کو جو قرآن پڑھایا جارہا ہے اس میں جہاد کا ذکر ہے۔ سعودی قرآن کی تحریف کیسے کریں گے؟ خطبوں میں تو انہوں نے روک دیا ہے کہ جہادی آیات پر خطبے نہ دیے جائیں۔ اسی طرح قرآن میں موجود یہود و نصاریٰ کی آیات کو خطبے میں نہ لیا جائے۔ یہ قانون نافذ ہو چکا ہے۔ البتہ مدارس میں تو قرآن پورا پڑھایا جاتا ہے۔ اللہ نے اس کا خود ذمہ نہ لیا ہوتا تو شاید یہ جہاد کی آیات بھی قرآن سے نکال دیتے۔ ع ''خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں!''

یہ جو تیز و تُند سیلاب آرہا ہے' اس کی معرفت کو سمجھیے۔ اس کا ایک outward دل ہے جس کے اندر کوئی اور شے ہے۔ باہر کا خول ہے امریکہ' جو یہ کہتا ہے کہ ہم نے پوری دنیا کو کنٹرول کر کے ایک ملک بنانا ہے۔ اسے جہاں سے بھی اندیشہ ہوگا' وہ اس کے خلاف کارروائی کرسکتا ہے چاہے کوئی حقیقی جواز ہو یا نہ ہو۔ وہ حملہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے لیے سارے بین الاقوامی قوانین اور دستور ختم ہو چکے ہیں۔ امریکہ میں مَیں خود جاتا رہا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ ہمیں آزادی تھی کہ ایک دفعہ کسٹم سے کلیئر ہو گیا تو اس کے بعد راستہ کھلا ہے۔ حکومت کا کوئی کردار نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اب سارے بنیادی حقوق سلب ہو چکے ہیں۔ امریکی دانشور چیخ رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں مجھے ایک مضمون ملا جس میں ایک امریکن مصنف نے لکھا ہے کہ امریکہ کو ایک ''پرل ہاربر'' کی ضرورت تھی۔ جیسے دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کیا تو یہ شیر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور ایٹم بم بھی استعمال ہو گیا' اسی طرح ان کو ایک اور پرل ہاربر چاہیے تھا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر

حملہ ان کا پرل ہاربر ہے۔ اس میں امریکہ کے اپنے جنگجو لوگ شامل ہیں۔ یہ خود انہوں نے کروایا ہے تاکہ لوگوں میں انتقامی جوش پیدا ہو جائے اور وہ ایک بڑے دفاعی بجٹ کو منظور کر دیں۔ یہ لکھنے والا کوئی مسلمان نہیں امریکہ کا شہری ہے۔ یہ ہے ورلڈ domination کا وہ خواب جو امریکن چاہتے ہیں۔ دوسرا معاملہ تیل کا ہے۔ جنگ کے خلاف تین تین لاکھ کے جلوس نکلے ہیں کہ عراق پر حملہ نہ کیا جائے' لیکن پھر بھی انتخابات میں ری پبلکن پارٹی جیت گئی۔ انہوں نے ایسے ایسے سبز باغ دکھا رکھے ہیں کہ ہماری معیشت کا دار و مدار تیل پر ہے اور تیل کے بڑے ذخائر سعودی عرب اور عراق میں ہیں' لہٰذا اب ان پر قبضہ کرنا ہے۔

امریکہ ایک خول کی مانند ہے۔ دراصل وہ اسرائیل کا تحفظ چاہتا ہے۔ چنانچہ خلیجی جنگ کے بعد امریکی کمانڈر انچیف نے صاف صاف کہہ دیا تھا: ''ہم تو اس جنگ میں اسرائیل کو بچانے نکلے ہیں۔'' عرب ممالک میں ایک تو صدام حسین ہے جس کی وجہ سے اسرائیل کو اندیشہ ہے۔ اسرائیل کو دوسرا خوف ہے تو پاکستان سے ہے۔ ۱۹۶۷ء میں چھ روزہ جنگ کے بعد جب یہودیوں کو عظیم فتح حاصل ہوئی تو پیرس میں انہوں نے جشن منایا۔ اس موقع پر بن گوریان نے تقریر کے دوران کہا تھا کہ ہمیں کسی عرب ملک سے کوئی خطرہ نہیں ہے' اگر حقیقی خطرہ ہے تو پاکستان سے ہے۔ پاکستان اس وقت تک ایٹمی طاقت نہیں بنا تھا' لیکن پاکستانی فوج اور پاکستانی عوام کے مذہبی جذبے کا معاملہ حساس تھا۔ اس حوالے سے اب وہ پہلے والی کیفیت نظر نہیں آتی۔ سارا رعب و دبدبہ اب ختم ہو رہا ہے۔ ہماری فوج کو امریکہ نے Rogue Army (بدمعاشوں کی آرمی) قرار دیا تھا' لیکن جب جنرل پرویز مشرف ۲۰۰۱ء میں بش کی جیب میں چلے گئے تو اب انہوں نے تھوڑا سا نظر انداز کیا ہے' ورنہ یہ کہ آپ بچنے والے نہیں ہیں۔ سارے عرب ممالک میں محسوس ہو رہا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے' ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ فلسطین کے اندر آج کتنے گھر ہیں جو اُڑا دیے گئے۔ فلاں شخص کو پکڑ کر مار ڈالا۔ کہاں اسرائیل کے اندر ایک فلسطینی ریاست کے قیام کا مرحلہ آ گیا تھا' اور کہاں سب نسیاً منسیا ہو گیا۔ اس نے ہر

جگہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ دندناتا ہوا جدھر چاہے ٹینک لے جائے۔ روزانہ کتنے لوگ مارے جا رہے ہیں۔ شیرون صاف کہہ رہا ہے کہ ہم ان کی کمر توڑ دینا چاہتے ہیں' کوئی activist باقی نہ رہے۔ ایسے الفاظ سننے کو مل رہے ہیں کہ عربوں کو زیادہ سے زیادہ وہ سٹیٹس دیا جائے گا جو امریکہ میں ریڈ انڈینز کو حاصل تھا۔ تیس کروڑ عرب اور سب اسلامی ممالک دَم سادھے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ہے وہ ﴿ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ﴾۔

دنیا میں ڈیڑھ ارب مسلمان اور ۵۷ اسلامی ممالک ہیں مگر کیا مجال کہ جو ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں۔ بیٹھ کر سوچیں کہ کیا طوفان آ رہا ہے! ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کہنے کو ہم امریکہ کے بڑے دوست ہیں لیکن امریکہ میں ہمارے شہریوں کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے! ایک مسلمان پروفیسر کینیڈا سے واشنگٹن پہنچتا ہے۔ اس نے ایک کانفرنس میں شرکت کرنی ہے' جس کا باقاعدہ دعوت نامہ آیا ہوا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ پاکستان میں پیدا ہوا' کینیڈین شہریت ہے۔ پندرہ گھنٹے اس کو خراب کیا ہے۔ تنگ آ کر اس نے کہا کہ چھوڑ دیں' واپس جا رہا ہوں تو بتایا گیا کہ آپ واپس بھی نہیں جا سکتے جب تک آپ کے فنگر پرنٹ اور فوٹو نہ لے لیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر ہماری حکومت کیا کر رہی ہے؟ ڈاکٹر عامر عزیز کو اٹھا کر لے گئے۔ ڈاکٹر احمد خواجہ انتہائی نیک آدمی ہیں' ان کے اندر جذبہ تھا کہ اپنے افغان بھائیوں کی مدد کریں۔ اب یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ خاندان کے نو افراد ایک ہی رات میں اٹھا کر لے گئے۔ کراچی میں گئے ہوئے ان کے ماموں جو ۸۰ برس کے ہیں' ان کو بھی لے گئے۔ ہماری حاکمیت کو کھیل میں لگا دیا گیا ہے۔ الیکشن ہو رہے ہیں۔ وزارتیں تقسیم ہو رہی ہیں۔ یہ ہمارا میوزیکل چیئر ہے جبکہ اصل اختیار کسی اور کے پاس ہے۔ یہ ہے اصل میں وہ عذاب!

یہود کا مسلمانوں سے تقابل کیا ہے؟ یہود کا جرم اکہرا ہے جبکہ ہمارا دوہرا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہود کا یہ کام نہیں تھا کہ وہ باقی دنیا تک اللہ کا دین پہنچائیں۔ ان کو صرف یہ حکم تھا کہ عمل کرو۔ یہ نہیں تھا کہ پوری دنیا تک پہنچانا ہے۔ کتاب بھی دی گئی تو صرف بنی اسرائیل کے لیے' جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ (سبا:۲۸)

’’اور ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام دنیا والوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر۔‘‘

اب اُمّت کا یہ فرض تھا کہ وہ پوری دنیا تک اسلام کو پہنچائیں کجا یہ کہ ہم نے خود بھی اسلام کا دامن چھوڑ دیا۔ پوری دنیا میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جس کو ہم نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ سب سے بڑی بدبختی یہ ہے ہم نے ہندوستان کو تقسیم کرایا‘ لاکھوں آدمی مارے گئے‘ خونی لکیر کھنچوائی‘ عصمتیں لٹیں اور یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہوا مگر وہ اسلام آج تک قائم نہیں ہوا۔ عریانی اور فحاشی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ تینتیس فیصد خواتین یونین کونسل کی سطح پر لا کر میدان میں بٹھا دی گئی ہیں۔ مخلوط معاشرت کا جو فتنہ اب آ رہا ہے وہ کبھی نہیں آیا۔ پوری دنیا میں کہیں بھی تینتیس فیصد سیٹیں خواتین کے لیے مخصوص نہیں کی گئیں‘ چاہے کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت کا دعوے دار ملک ہو۔ درحقیقت عالمِ اسلام کو برباد کرنے کے پروگرام دیے جا رہے ہیں کہ جو تہذیب ہماری ہے وہی تمہاری ہونی چاہیے۔ انہوں نے جو راستہ صدیوں میں طے کیا ہے‘ وہ ہم سے طے کرانا چاہتے ہیں۔ اس سے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے کہ اگر ہم دنیا میں کسی ایک ملک میں اسلام کا نظام قائم کر کے دکھا دیں تو اللہ کی طرف سے اس کے عذاب کی گرفت سے نکل آئیں گے۔ ہمیں گواہ بنایا گیا ہے اور گواہی بھی پوری دنیا کی۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ؕ﴾ (البقرہ:۱۴۳)

’’اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمّتِ وَسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔‘‘

افسوس یہ ہے کہ وہ ملک جو اسلام کے نام پر بنا‘ وہیں اسلام نہیں آیا!

اقول قول هذا واستغفر الله لی ولكم ولسائر المسلمين والمسلمات

اسلام کا سیاسی نظام

ایوب بیگ مرزا

’’عدل‘‘ اسلام کا catchword ہے اور اسلامی نظام میں روح یا ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے تین پہلو ہیں۔ معاشرتی سطح پر مرد اور عورت‘ معاشی سطح پر آجر اور مستأجر یعنی سرمایہ دار اور مزدور جبکہ سیاسی سطح پر حکمران اور عوام کے حقوق و فرائض میں عدل پیدا کرنا انسان کی سب سے بڑی اجتماعی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ توازن عدل کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس تحریر میں ہم سیاسی سطح پر عدل یعنی حکمران اور عوام کے درمیان عادلانہ توازن کے حوالے سے اسلام کے اصولوں کا ذکر کریں گے۔ اسلام سیاسی سطح پر صرف بنیادی اصول دیتا ہے جس کی روشنی میں وقت کے تقاضوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مکمل عادلانہ و منصفانہ نظام طے کرنا ’’اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ‘‘ کے قرآنی اصول کے مطابق مسلمانوں کے اجتماعی شعور اور مرضی پر چھوڑ دیتا ہے۔

سیاسی نظام کے حوالے سے شریعت کا پہلا اصول یہ ہے کہ اصل اور مطلق حاکم تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وقت کے پیغمبر علیہ السلام اللہ کے خلیفہ ہوا کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ کے احکامات نافذ کرتے اور ان کی روشنی میں زندگی کے بقیہ معاملات طے کرتے تھے۔ ختمِ نبوت کے بعد جس طرح وہ ذمہ داری جو رسول ادا کرتے تھے‘ اس اُمّت کو منتقل ہوئی‘ اسی طرح خلافت والا منصب بھی پوری اُمّت کو بحیثیت مجموعی منتقل ہوا۔ چاروں خلفائے راشدین مختلف طریقے سے منتخب ہوئے‘ لہٰذا مسلمانوں کو آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی بھی انداز میں اپنا خلیفہ منتخب کر سکتے ہیں‘ شرط صرف ایک ہے کہ انہیں قرآن وسُنّت کی حدود کے اندر رہنا ہوگا۔ یہاں اس تاریخی واقعہ کی مثال دینا مفید ہوگا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حج کے ایّام میں بتایا گیا کہ کچھ لوگ فلاں شخص کو آپ کے بعد خلیفہ بنانے کا ذکر کر رہے ہیں تو انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ یہ تو لوگوں کا حق ہے کہ وہ طے کریں کہ ان کا خلیفہ کون ہوگا۔ گویا کسی کو اُن پر جبراً مسلّط نہیں کیا جا سکتا (کوئی مسلّط ہو جائے تو پھر عوام کو کیا کرنا چاہیے‘ یہ ایک الگ بحث ہے)۔ لہٰذا اُمّتِ مُسلمہ کا ہر ہر فرد ’’اَلْمُسْلِمُ كُفُوٌ لِمُسْلِمٍ‘‘

کے اصول کے مطابق اللہ کا خلیفہ ہے جو اپنا حق خلافت اپنے میں سے کسی دیانت دار اور اہل شخص کے سپرد کر کے اُسے بطور خلیفہ چن سکتا ہے۔ پھر بطور خلیفہ اُس کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ قرآن وسُنّت کی بالادستی قائم کرے اور اس کی روشنی میں باہمی مشورہ سے بقیہ معاملات طے کرے۔ پس ''اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ '' کے اصول کے مطابق مسلمانوں کا باہمی مشورہ سے اپنے میں سے کسی کو خلیفہ بنا لینا اسلام کے سیاسی نظام کا دوسرا اصول ہے۔ ہم نے یہ وضاحت کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ ہمارے ہاں اس حوالے سے دوطرفہ انتہا پسندی ہے۔ ایک طرف جمہوریت پسند ہیں جو کہتے ہیں کہ جمہور کو مطلق اختیارات حاصل ہیں ۔وہ سیاہ کرے یا سفید' اس پر کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے۔لوگوں کی لوگوں پر لوگوں کے لیے حکومت ہونی چاہیے۔قرآن وسُنّت کی بالادستی کی اہمیت والے اسلامی اصول کو یا تو وہ سمجھتے ہی نہیں یا نظر انداز کرتے ہیں۔دوسری طرف مذہبی لوگ یہ کہہ کر بات ختم کردیتے ہیں کہ شریعت کی بالادستی قائم ہونی چاہیے لیکن اِس کے ساتھ عوامی منشا کو نافذ کرنے کی اہمیت والے اسلامی اصول کو یا تو وہ سمجھتے ہی نہیں یا نظر انداز کردیتے ہیں۔

موجودہ دور میں اسلام کے سیاسی نظام کی صحیح سپرٹ اور عادلانہ توازن کی صحیح ترین توجیہہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی کتاب ''پاکستان میں نظامِ خلافت : کیا' کیوں اور کیسے؟'' میں کی ہے۔ اس میں قرآن وسُنّت کی بالادستی اور مسلمانوں کی طرف سے حق رائے دہی کے ذریعے خلیفہ کے چناؤ کے دونوں اصولوں کی باریکیوں کو واضح کیا گیا ہے۔آئین میں یہ طے کیا جائے کہ قرآن وسُنّت سے منافی قانون سازی کسی سطح پر بھی نہیں کی جاسکے گی۔ لہٰذا قرآن وسُنّت کی روشنی میں اہلِ علم اجتہاد کریں اور جدید اجتماعی مسائل کے مختلف حل تجویز کریں۔عوام الناس اپنے نمائندوں کے ذریعے جس اسلامی حل کو اپنے لیے زیادہ موزوں سمجھیں' اسے اختیار کریں۔اگر کوئی شخص یا جماعت سمجھے کہ فلاں حل قرآن وسُنّت کے دائرے سے باہر ہے تو وہ ملک کے آئین کی محافظ عدالت عظمیٰ (سپریم کورٹ) میں جا کر قرآن وسُنّت اور جدید مسائل کے ماہرین کے سامنے دلائل سے ثابت کردے اور منظور شدہ غیر اسلامی قانون کو کالعدم قرار دلوادے۔ نتیجتاً جو قانون بنے' انتظامیہ اسے مکمل شفافیت کے ساتھ نافذ کرے اور قانون کی حکمرانی کو یقینی بنائے جس کے سامنے تمام شہری برابر ہوں' کسی کو استثنا حاصل نہ ہو۔ ملک کا سربراہ بھی کسی غیر مسلم اقلیت کے ایک فرد کے ساتھ عدالت میں یکساں طور پر پیش ہو اور جج اسلامی قانون کی روشنی میں آزادانہ فیصلے

سنائیں۔ مناسب وقفہ سے خلیفہ کے چناؤ کے لیے بروقت‘ شفاف اور غیر جانبدارانہ ماحول میں چناؤ کا تسلسل ضروری ہے۔ اس میں رکاوٹ ڈالنا معاشرہ میں حبس پیدا کرتا ہے‘ جس کا نتیجہ انتشار اور انارکی ہے۔ ماضی کی مسلمان سلطنتوں میں اقتدار کی خونی رسہ کشی اور گردن زدنی اسی کا نتیجہ تھی‘ جس سے بچنا ضروری ہے تاکہ عوامی انداز میں پُرامن سیاسی عمل انتہائی مناسب اور معتدل انداز میں جاری وساری رہے۔ اللہ ربّ العالمین تمام جہانوں کا صرف حاکم ہی نہیں پروردگار بھی ہے‘ لہٰذا اسلامی ریاست اللہ کے نائب کے طور پر شہریوں پر اللہ کا حکم نافذ کرنے ہی کی نہیں بلکہ ان کی پرورش اور کفالت کی ذمہ دار بھی ہے۔ دراصل یہ دونوں باتیں لازم وملزوم ہیں۔ خلافتِ راشدہ میں قحط کے دوران کفالت کا معاملہ کمزور پڑا تو حضرت عمر فاروق ؓ نے چوری کی قرآنی حد پر مبنی سزا عارضی طور پر معطل فرما کر مثال قائم کردی۔ اس حوالے سے بھی ہم انتہا پسندی کا شکار ہیں۔ مذہبی طبقہ کی نظر شرعی احکامات وحدود کے نفاذ پر ہے جبکہ جدید طبقہ صرف کفالتِ عامہ کے تصور کا قائل ہے۔ اسلام کی منشا ان میں جامعیت اور اعتدال پیدا کرنا نظر آتی ہے۔

اب حکمران اور عوام کے درمیان حقوق وفرائض کے توازن کی بات کرتے ہیں۔ جس طرح مرد وعورت کی آزاد مرضی سے کیے گئے نکاح کے نتیجے میں قائم ہونے والے گھر کا قانونی سربراہ اور کفالت کا ذمہ دار مرد ہے جبکہ عورت پر شریعت کے دائرے میں اس کی اطاعت لازم ہے‘ بالکل اسی طرح عوام الناس کی آزادانہ مرضی سے قائم ہونے والی حکومت کی اطاعت ان پر لازم ہے اور حکومت پر عوام الناس کی کفالت لازم ہے۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ کے مصداق حکومتی سربراہ دراصل قوم کی خدمت پر مامور ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اپنے کندھے پر آٹا لاد کر پہنچانے جیسی خدمت اور حریت ومساوات کی کئی مثالیں دورِ خلافتِ راشدہ میں موجود ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ

"Authority brings responsibility and Responsibility gives Authority "

یعنی اختیار ذمہ داری سونپتا ہے اور ذمہ داری اختیار دیتی ہے۔ جس کو جتنا اختیار ہو‘ اس کی اتنی ہی ذمہ داری ہے اور جس کی جتنی ذمہ داری ہے‘ اس کو اتنا ہی اختیار دیا گیا ہے۔

یہاں سے ہم اپنی بات کو پاکستان کے مخصوص معروضی حالات کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہمارے تمام عہدہ داروں اور اداروں بشمول عدلیہ‘ پارلیمنٹ‘ انتظامیہ‘ فوج اور سیاسی حکومتوں کو یہ

معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا جتنا اختیار ہے اتنی ہی ذمہ داری ہے۔ چونکہ آج کی جدید ریاست کی مختلف ذمہ داریاں اس قدر پیچیدہ اور اسپیشلائزڈ ہیں کہ ایک طبقہ دوسرے کی ذمہ داری ادا نہیں کرسکتا‘ لہٰذا جب آپ کسی اور کے اختیار پر قابض ہوں گے تو لامحالہ اس کی ذمہ داری بھی آپ پر آئے گی جو آپ سے ادا نہیں ہو سکے گی‘ جس کے آپ جواب دہ ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی فریق اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دے گا تو اسے اپنے اختیارات سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا جس کے لیے اسے عوام کے سامنے جواب دہی کرنا ہوگی۔ ذمہ داری اور اختیار کے اس توازن کو قائم کرنے کی آج بہت زیادہ ضرورت ہے۔ جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے یا دوسرے کے اختیار چھیننے میں پہل کس نے کی تو یہ انڈا مرغی والی تاریخی بحث ہے‘ لہٰذا ہم اس سے کنارہ کشی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔

جمہوریت میں عوامی حاکمیت کا تصور ہے جب کہ اسلام میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کو کلیتاً تسلیم کرتے ہوئے عوامی خلافت کا تصور ہے۔ ہم حاکمیت اور خلافت کے فرق کو واضح کر چکے ہیں‘ اب ہمیں عوام کی اہمیت کو بھی سمجھنا ہوگا۔ اگر عوام کی اخلاقی سطح اور سیاسی شعور پختہ نہ ہو تو متذکرہ بالا اصولوں پر نہ کوئی ریاست قائم ہوسکتی ہے نہ قائم رہ سکتی ہے۔ لہٰذا عوام میں پیسے اور طاقت کے حامل طبقہ کا اثر ورسوخ ختم کر کے ایسے اہل لوگ جو دیانت داری اور اخلاق کی اعلیٰ قدر ومنزلت کے حامل ہوں‘ اُن کی صلاحیتیں بروئے کار لانا اس عادلانہ ریاست کو قائم کرنے کے لیے شرطِ اوّل ہے۔ اسی طرح عوام میں سیاسی شعور کے ذریعے ان کے اجتماعی فائدے اور نقصان کی اہمیت ان پر واضح کرنا اور اس کے لیے ذاتی وگروہی مفادات کو قربان کرنے کا جذبہ بیدار کرنا دوسری شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ مادہ پرستی اور مفاد پرستی کے مقابلے میں خدا پرستی کی بنا پر اخلاقی وملی جذبہ بیدار کرنے کا یہ کام کسی ایسی جماعت کے بغیر ممکن نہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی کتاب قرآنِ مجید کی داعی بن کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے تن مَن دھن قربان کرتے ہوئے میدان میں ڈٹ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے۔ بقول اقبال: ؎

تا خلافت کی بِنا دنیا میں ہو پھر اُستوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر!

❁❁❁

اسماء اللہ الحسنیٰ

از: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

سورۃ الاعراف میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۸۰﴾

''اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں' تو پکارو اُسے اُن (اچھے ناموں) سے' اور چھوڑ دو اُن لوگوں کو جو اُس کے ناموں میں کجی نکالتے ہیں۔ عنقریب وہ بدلہ پائیں گے اپنے اعمال کا۔''

سورۂ بنی اسرائیل' آیت ۱۱۰ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾

''آپؐ کہہ دیجیے کہ تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔ جس نام سے بھی تم پکارو سب اچھے نام اُسی کے ہیں۔''

سورۃ الحشر میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۴﴾

''وہی ہے اللہ' تخلیق کا منصوبہ بنانے والا' وجود بخشنے والا' صورت گری کرنے والا۔ تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔ اُسی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا۔''

حُسنیٰ' أحسن کی تانیث ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اچھے ناموں سے مراد وہ نام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات' اُس کی عظمت و جلالت اور اُس کی قدرت و طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ لفظ' اسم' سمو سے بنایا گیا ہے' جس کے معنی ہیں کسی چیز کی بلندی' برتری' اونچی اور چوٹی کی وہ علامت جس سے وہ چیز دیگر اشیاء سے ممیز' برتر اور علیحدہ شمار میں آتی ہے۔ چونکہ تعین اسم کے فوائد

واغراض یہی ہیں‘ اسی لیے نام کو اسم کہا جاتا ہے۔اس کی جمع اسماء ہے۔

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

((لِلّٰهِ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ اِسْمًا، مِائَةٌ إِلَّا وَاحِدًا، لَا يَحْفَظُهَا أَحَدٌ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَهُوَ وَتْرٌ يُحِبُّ الْوَتْرَ)) (صحيح البخاری)

’’اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں یعنی ایک کم سو‘ جس نے ان کو حفظ (یاد) کرلیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق سے محبت رکھتا ہے۔‘‘

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

((اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا، مَنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَاللّٰهُ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ)) وفی رواية ابن ابی عمر:((مَنْ اَحْصَاهَا)) (صحیح مسلم)

’’اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں‘ جس نے ان کو حفظ کرلیا وہ جنت میں داخل ہوا۔ اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو محبوب رکھتا ہے۔‘‘ اور ابن ابی عمر کی روایت میں حَفِظَهَا کی جگہ اَحْصَاهَا (ان کو شمار کرلیا) ہے۔‘‘

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ)) وَزَادَ هَمَّامٌ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: ((إِنَّهُ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ)) (متفق علیه)

’’بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں‘ ایک کم سو‘ جس نے ان کو شمار کر رکھا وہ جنت میں داخل ہوا۔‘‘ اور ہمام نے ابوہریرہ کی روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ فقرہ زیادہ کیا کہ ’’وہ (اللہ) طاق ہے اور طاق کو محبوب رکھتا ہے۔‘‘

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ)) (سنن الترمذی)

’’بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں‘ جس نے ان کو شمار کر رکھا وہ جنت میں داخل ہوا۔‘‘

(۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے:

((إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالَى تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا، مِائَةً غَيْرَ وَاحِدَةٍ، مَنْ

أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ، هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ......الخ)) (سنن الترمذی)

''یقیناً اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں' ایک کم سو' جس نے ان کو شمار کر لیا وہ جنت میں داخل ہوا' اور وہ (نام) ہیں :اللہ جس کے سوا کوئی (اور) معبود نہیں' الرحمٰن الرحیم ...... وھی آخر''

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے' بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا، مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا، إِنَّهُ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ، مَنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَهِيَ: اللّٰهُ الْوَاحِدُ الصَّمَدُ الْأَوَّلُ الْآخِرُ ...... وھی آخر)) (سنن ابن ماجه)

''یقیناً اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں' ایک کم سو' بے شک وہ (اللہ) طاق ہے اور طاق کو پسند فرماتا ہے۔ جس نے ان ناموں کو (قولاً وعملاً) حفظ کر لیا وہ جنت میں داخل ہوا' اور وہ نام یہ ہیں: اللّٰهُ الْوَاحِدُ الصَّمَدُ الْأَوَّلُ الْآخِرُ ...... وھی آخر''

احادیث کی رو سے جن میں تفصیلی اسماء الحسنیٰ موجود ہیں' تین طُرق ہیں جو کہ محدّثین میں مشہور ہیں:

(ا) پہلا طریق امام ترمذی کا ہے جس کی سب سے زیادہ شہرت ہے۔ اس طریق کو محدثین کی زبان میں طریق (روایت) صفوان بن صالح کہتے ہیں۔ اس طریق کو امام ترمذی کے علاوہ معمولی اختلاف کے ساتھ طبرانی' ابن حبان اور ابن خزیمہ نے بھی بیان (روایت) کیا ہے۔

(ب) دوسرا طریق زہیر بن محمد کا ہے جسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔ اس میں ترمذی کے ناموں کے مقابلے میں زیادہ اختلاف ہے۔

(ج) تیسرا طریق عبدالعزیز بن حصین کا ہے جسے حاکم نے اپنی مستدرک میں بیان کیا ہے۔ اس میں کئی اسماء ترمذی و ابن ماجہ دونوں سے مختلف ہیں۔

جامع ترمذی کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ))

''اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں' جس نے ان کو شمار کر لیا (گھیر لیا) وہ جنت میں داخل ہوا۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرمانے سے یہ ثابت ہوا کہ اسم پاک ’’اللہ‘‘ کے سوا ننانوے نام اور ہیں جو اسی اسم ذات کی طرف مضاف ہیں۔ گویا کہ یہ قرین قیاس ہے کہ ننانوے کا شمار اسم ’’اللہ‘‘ کے علاوہ ہو اور یہ اسم اپنی شمولیت کے بعد شمار کو پورا پورا سو بنا دیتا ہو۔ یہی مفہوم رائج ہے۔

یہاں حدیث میں جو ’’اَحْصَاھَا‘‘ کا استعمال ہوا ہے‘ اس کے علماء نے متعدد معنی بیان کیے ہیں۔ اکثر نے اس کے معنی ’’حَفِظَھَا‘‘ اختیار کیے ہیں‘ کیونکہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ’’اَحْصَاھَا‘‘ کی جگہ ’’حَفِظَھَا‘‘ استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اَحْصَاھَا کے متعدد معنی ہیں‘ جبکہ اس مفہوم کی بھی تردید کی گئی ہے کہ صرف زبانی یاد کر لینا ہی اَحْصَاھَا کے مقصد کو پورا کر دیتا ہے۔ ’’فتح الباری‘‘ میں ہے:

(۱) اَحْصَاھَا کے معنی یہ ہیں کہ دعا مانگنے والا صرف چند اسماء پر ہی اکتفا نہ کرلے بلکہ جملہ اسماء کو پڑھ کر دعا مانگا کرے۔

(۲) ان اسماء کے حقوق پر قیام اور اس کے مقتضٰی پر عمل کرنا مراد ہے۔ مثلاً ’’الرزّاق‘‘ کہے تو اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی پر پورا اعتبار بھی کرے۔

(۳) اَحْصَاھَا سے مراد معانی اسماء کا بخوبی سمجھ لینا ہے۔ محاورہ ہے: فلانٌ ذُوحصاۃٍ یعنی فلاں شخص صاحبِ عقل و ہوش ہے۔

قرطبی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ مندرجہ بالا تینوں صورتوں میں سے خواہ کوئی بھی صورت ہو‘ صحت نیت کے بعد ہر ایک صورت بندے کو جنت میں لے جانے کے لیے کافی ہے۔

(۴) اَحْصَاھَا کے معنی معرفت کے ہیں‘ کیونکہ جو ان اسماء کا عارف ہوگا وہ مؤمن ہوگا اور جو مؤمن ہوگا وہ جنت میں ہی جائے گا۔ معرفت میں اعتقاد کو بھی شامل سمجھیں۔ مثلاً جو دہریہ ہے اسے اسم خالق پر اعتقاد نہیں اور جو صرف فلسفی ہے اسے اسم قادر کے معنی پر پورا یقین نہیں۔

(۵) اَحْصَاھَا کے معنی عمل کرنا کے ہیں۔ مثلاً جو اللہ تعالیٰ کو حکیم سمجھتا ہے وہ اس کے جملہ احکام کو بحسب حکمت ہونا بھی تسلیم کرنا ہے۔ اسی طرح جو اللہ تعالیٰ کو قدوس جانتا ہے‘ وہ یہ اعتقاد بھی رکھتا ہے کہ وہ ذات جملہ نقائص سے منزہ و پاک ہے۔ ابو وفاء بن عقیل نے انہی

معانی کو تسلیم کیا ہے۔

(۶) ابن ابطال کا کہنا ہے کہ طریقِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ بعض اسماء تو وہ ہیں کہ جن کی صفات کا اقتدا ہو سکتا ہے‘ مثلاً رحیم و کریم کہ ان صفات پر بندہ خود کو بھی ان کا خوگر بنا سکتا ہے اور بعض صفات وہ ہیں کہ جن کا اقتدا بندے کے لیے ممکن نہیں‘ جیسے جبار و عظیم وغیرہ۔ ایسے اسماء کے متعلق طریقِ عمل یہ ہے کہ ان صفات کو اللہ تعالیٰ سے خاص سمجھے‘ ان کا اقرار کرے اور خشوع و خضوع اختیار کرے۔ جن اسماء سے وعدۂ نعمت ملتا ہو‘ ان میں طمع و رغبت پیدا کرے اور جن اسماء میں وعید ہو‘ اس مقام پر خوف و خشیت کو لازمِ احوال بنائے۔ ”حَفِظَهَا“ اور ”اَحْصَاهَا“ کے معنی یہی ہیں۔

اب بفضلہٖ شرح اسماء الحسنیٰ کی ابتدا کی جاتی ہے:

(۱) اللّٰہ

یہ اسم مبارک اللّٰہ کا خاصہ ہے کہ ”الٰہ“ پر الف لام تعریف داخل ہو کر جز وکلمہ بن گیا‘ یہاں تک کہ بعض نے اللہ کو اسم ذاتی قرار دیا اور الف لام تعریف ہونے سے انکار کیا ہے۔ یہ اسم اللہ ہی کا خاصّہ ہے کہ اس پر تائے قسم وارد ہوتی ہے‘ ورنہ حرفِ ”تَ“ بمعنی قسم کسی اور اسم پر وارد نہیں ہوتا۔ یہ اسم اللّٰہ ہی کا خاصہ ہے کہ اَلْحَمْدُ کا استعمال اسی ذات کے لیے ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا جاتا ہے‘ الحمد لِلرحمٰن یا الحمد لِلرحیم وغیرہ نہیں بولا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ اسم مسمیٰ کی ذات وصفات سب پر مجموعاً حاوی ہے‘ اسی طرح لفظ حمد بھی جملہ نعمت کمال وجلال کا جامع ہے۔ لہٰذا اکامل تر اسم کے لیے کامل لغت کی ضرورت تھی۔ یہ اسم اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس کے آخر میں حرفِ میم شامل کیا جاتا ہے اور وہ حرفِ ندا کا کام دیتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ الگ سے حرفِ ندا شامل نہیں رہتا‘ یعنی اَللّٰھُمَّ کی جگہ یا اَللّٰھُمَّ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ ہی وہ اسم ذات ہے جو جملہ صفات کو اپنے اندر موجود رکھتا ہے۔ اللہ ہی وہ اسمِ ذات ہے کہ صفات اس کے مسمّٰی سے نہ خارج ہیں‘ نہ زائد ہیں اور نہ ہی اس کی ذات وصفات میں تفریق ممکن ہے۔ اللہ ہی وہ ذات ہے کہ جس کا عرفان‘ عقل اپنے شواہد سے‘ فطرت اپنے معالم سے‘ رُوح اپنے مدارج سے‘ قلب اپنے حقائق سے اور ایمان اپنی تصدیق سے حاصل کرتا ہے۔ اللہ ہی وہ ذات ہے جو نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔

(۱) ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾﴾

(آل عمران)

''کہو: اے اللہ! تمام بادشاہت کے مالک! تُو حکومت اور اختیار دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور تُو سلطنت چھین لیتا ہے جس سے چاہتا ہے' اور تُو عزّت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور تُو ذلیل کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں سب خیر ہے۔ یقیناً تُو ہر چیز پر قادر ہے۔''

(۲) ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الزمر)

''آپؐ کہیے: اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! غائب اور حاضر کے جاننے والے! یقیناً تُو فیصلہ کرے گا اپنے بندوں کے مابین اُن تمام چیزوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔''

صحاحِ ستّہ کی اکثر کتب میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک شخص کو یہ دعا کرتے سنا:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ بِأَنَّ لَكَ الْحَمْدَ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، الْمَنَّانُ بَدِيعُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ، يَا حَيُّ يَا قَيُّومُ))

''اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں اس وسیلے سے کہ ساری حمد تیرے لیے ہے' تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں' تُو واحد (اکیلا) ہے' تیرا کوئی شریک نہیں' تُو ہی احسان کرنے والا اور آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اے جلال اور عطاء و بخشش والے' اے زندہ وجاوید' اے آسمانوں اور زمینوں کو تھامنے والے!''

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اس شخص نے اللہ سے اس کے اسم اعظم کے ذریعے سوال کیا ہے کہ جب بھی اس کے ذریعے سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے' اور جب اس کے ذریعے دعا مانگی جائے تو وہ قبول کرتا ہے۔''

((اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ))

’’اے اللہ! مجھے اپنے حلال کے ساتھ حرام سے کفایت کرنا اور مجھے اپنے فضل کے ساتھ اپنے غیر سے بے پروا کرنا۔‘‘

’’اللہ‘‘ اسم عَلم ہے اور ذات باری تعالیٰ کے لیے خاص الخاص ہے۔ علمائے راسخین کے قول کے مطابق یہ اسم کسی سے مشتق نہیں۔ صحیح بخاری‘ سنن ترمذی اور دیگر کُتبِ حدیث میں بعض الفاظ کے فرق سے حضورﷺ کی زبانی ہمیں یہ دعا ’’سید الاستغفار‘‘ سکھائی گئی ہے:

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، وَ أَبُوءُ إِلَيْكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَعْتَرِفُ بِذُنُوبِي، فَاغْفِرْ لِي ذُنُوبِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ))

’’یا اللہ! میرا پروردگار تُو ہی ہے‘ تیرے سوا کوئی معبود نہیں‘ تُو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں‘ تیرے عہد اور وعدہ پر اپنی استطاعت کے موافق قائم ہوں۔ جو کچھ بھی میں نے کیا اس کی بدی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ تیری جس قدر نعمتیں مجھ پر ہیں ان کا مجھے اقرار ہے‘ مجھے اپنے گناہوں کا بھی اقرار ہے۔ پس تُو مجھے معاف کر دے‘ بے شک گناہوں کو صرف تُو ہی معاف کر سکتا ہے۔‘‘

(۲) اَلرَّحْمٰنُ

رحمٰن اور رحیم دونوں کا اشتقاق رحمت سے ہے مگر ہر دو اسماء میں خصوصیات جداگانہ بھی ہیں۔ الرحمٰن علمیت کے لحاظ سے اسم اللہ کے برابر ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾

’’(اے نبیﷺ!) کہہ دیجیے کہ اللہ کہو یا رحمٰن کہو۔ ان میں سے کچھ بھی کہہ لو‘ اللہ کے تو سب نام احسن و بہتر ہیں۔‘‘

رحمٰن‘ رحمت سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ نظامِ عالم کی بنیاد اسی رحمت سے ہے۔ رحمٰن وہ ہے جس میں رحمت بدرجۂ اَتم موجود ہو۔ سورۃ الانبیاء‘ آیت ۱۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ﴾

’’اور ہمارا ربّ بڑا مہربان ہے جس سے مدد طلب کی جاتی ہے۔‘‘

سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیات میں واضح کیا گیا:

﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ ﴿۴﴾﴾

’’رحمٰن نے قرآن سکھایا‘ اُسی نے انسان کو پیدا کیا‘ اور اسے بولنا سکھایا۔‘‘

سورۂ مریم کی آیت ۹۳ میں بتایا گیا:

﴿اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾﴾

’’نہیں ہے کوئی آسمانوں اور زمین میں مگر وہ آئے گا رحمٰن کے حضور بندے کی حیثیت سے۔‘‘

مستدرک حاکم اور مسند بزار میں ایک خاص دعا نقل کی گئی:

اَللّٰھُمَّ فَارِجَ الْھَمِّ کَاشِفَ الْغَمِّ، مُجِیْبَ دَعْوَۃِ الْمُضْطَرِّیْنَ، رَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ وَرَحِیْمَھُمَا، مَا اَنْتَ تَرْحَمُنِیْ فَارْحَمْنِیْ بِرَحْمَۃٍ تُغْنِیْنِیْ بِھَا عَنْ رَحْمَۃِ مَنْ سِوَاکَ

’’اے اللہ! دل کی فکر کو دور کرنے والے‘ غم کو کھول دینے والے! اے بے قراروں کی پکار کو سننے والے‘ اور اے دنیا اور آخرت میں رحمت فرمانے والے‘ اور ہر دو جہاں میں رحم کرنے والے‘ مجھ پر رحم تو ہی فرمائے گا‘ اس لیے تُو ہی مجھ پر رحم فرما ایسی رحمت کے ساتھ جو مجھے سب کی رحمت سے بے پروا بنا دے۔‘‘

(۳) اَلرَّحِیۡمُ

یہ اسم بھی رحم سے بنا ہے۔ یہ وہ نام ہے جو رحمٰن کے ساتھ ایک بڑا تعلق رکھتا ہے۔ رحم کا اطلاق عموماً درماندہ‘ بے کس‘ عاجز و ناتواں اور مصیبت رسیدہ پر کیا جاتا ہے جبکہ رحیم وہ ہے جو ایسے بندوں پر التفات کرنے والا‘ ان کی بگڑی ہوئی کو بنا دینے والا اور ٹوٹی ہوئی کو جوڑ دینے والا ہو۔ طوفانِ نوح کے موقع پر جب حضرت نوح علیہ السلام بیٹے کو کشتی پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ میں پہاڑ پر چڑھ کر اس سے بچ جاؤں گا‘ تو جواب میں حضرت نوح علیہ السلام کا قول نقل کیا گیا ہے:

﴿قَالَ لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ ۚ﴾ (ھود:۴۳)

’’نوح نے کہا: آج کے دن کوئی بچانے والا نہیں ہے اللہ کے امر سے‘ سوائے اُس کے جس پر اللہ ہی رحم فرما دے۔‘‘

﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾﴾ (الفاتحہ)

’’بہت رحم فرمانے والا‘ نہایت مہربان ہے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا:

((اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ))

’’تم زمین والوں پر رحم کرو‘ آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔‘‘

اسی طرح ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتﷺ نے فرمایا:

((لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا))

’’جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑے کی عزت وتوقیر نہیں کرتا‘ وہ ہم میں سے نہیں۔‘‘

سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۲﴾

’’یقیناً اللہ توبہ کا بہت قبول فرمانے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۴۳﴾

’’بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنے والا‘ مہربان ہے۔‘‘

سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ۝۲۹﴾

’’یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔‘‘

حضورِ اقدسﷺ کی مشہور دعا جو آپؐ نے سفرِ طائف سے واپسی پر کی‘ اُس کا ایک حصہ ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ)) (بحوالہ تاریخ طبری‘ ج۱)

’’یا الٰہی! میں اپنی کمزوری‘ بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں‘ تُو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔‘‘

(۴) اَلْمَلِکُ

لغت میں مَلِک بادشاہ کو کہتے ہیں۔ دنیا میں اور لوگ بھی مَلِک کہلاتے ہیں اور یہ نام رکھنا شرک بھی نہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس کا استعمال اور لوگوں کے لیے ہوا ہے۔ سورۂ یوسف میں الملک کا لفظ آیا ہے اور اس سے مراد بادشاہِ مصر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ ......﴾ (آیت ۴۳)

’’بادشاہ نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں ......‘‘

قرآن مجید پر غور وفکر اور تدبّر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ’’الملک‘‘ کا اطلاق بحالت مضاف بھی ہوا ہے۔ سورۃ الناس میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝﴾

’’کہیے کہ مَیں پناہ میں آتا ہوں تمام انسانوں کے رب کی۔ تمام انسانوں کے بادشاہ کی۔‘‘

یہاں ’’مَلِكِ النَّاسِ‘‘ کے معنی ہیں کُل بنی نوعِ انسان کا بادشاہ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جملہ نوعِ انسانی کی حکومت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی اور نہ ہی ہوگی۔ سورۃ طٰہٰ کی آیت ۱۱۴ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ﴾

’’تو بہت بلند وبالا ہے اللہ‘ بادشاہ حقیقی۔‘‘

یہ تو ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی قطعہ اراضی کا مالک تو ہے مگر اس پر حکمران نہ ہو‘ مگر مَلِک کے لیے صفت حکمرانی کا ہونا ضروری ہے‘ خواہ وہ اس قطعہ اراضی پر مالکانہ حقوق نہ بھی رکھتا ہو۔ واضح رہے کہ سورۃ القمر کی آیت ﴿عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝﴾ میں مَلِيْك بھی اَلْمَلِک کے معنی میں ہی ہے۔

(۵) اَلْقُدُّوْس

لفظ قُدُّوْس اسم ہے اور اس کا فعل باب نصر ینصر سے آتا ہے۔ یہ تنزیہی نام ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ربّ العالمین جملہ نقائص وعیوب سے پاک ومنزہ ہے۔ سنن نسائی کی روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ بعد از فراغتِ وتر ’’سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْس، سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْس، سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْس، رَبُّ الْمَلَائِکَةِ وَ الرُّوْحِ‘‘ پڑھا کرتے تھے۔ سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْس کے ارشاد میں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کی گئی ہے اور اس کے ساتھ رَبُّ الْمَلَائِکَةِ وَالرُّوْح کے فرمان میں حکمت یہ ہے کہ فرشتے بھی قدسی کہلاتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھی روح القدس (پاک روح) کہا جاتا ہے۔

(باقی صفحہ 34 پر)

کامیاب لوگوں کی چار عادات

حدیثِ رسول ﷺ کی روشنی میں

طارق سہیل مرزا

اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں کامیاب زندگی کے لیے ایک دعا سکھائی ہے جو قرآن مجید میں آئی ہے:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴿۲۰۱﴾﴾ (البقرۃ)

”اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔“

اس دعا سے پتا چلتا ہے کہ بہترین اور کامیاب زندگی وہ ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کا احاطہ کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی زندگی میں بھی انقلاب لائے اور دوسروں کی زندگی میں بھی۔ ان کی کامیابی اتنی مکمل ہے کہ وہ آج بھی ہمارے لیے رول ماڈل ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ مذکورہ بالا دعا کی روشنی میں کوئی شک نہیں رہنا چاہیے کہ مسلمان دنیا میں پیچھے رہنے کے لیے نہیں آیا۔ اس نے دنیا میں آگے رہنا ہے تاکہ اللہ کا دین آگے رہے۔ اگر وہ دین کے غلبے کے لیے جِدّوجُہد کر رہا ہے اور دنیا میں بھی آگے ہے تو وہ پوری طرح کامیاب ہے۔ اگر ہم دنیا میں اپنے زعم میں کامیاب رہے لیکن اللہ کا دین مغلوب رہا تو ہماری کامیابی حقیقی نہیں۔

ایک کامیاب مسلمان وہ ہے جسے اُس کے خالق و مالک کی رضا حاصل ہو جائے۔ انسان اکیلے کامیاب زندگی نہیں گزار سکتا۔ زندگی میں کامیابی کے لیے ہمیں دوسروں کی مدد چاہیے۔ دوسرے افراد آپ سے تعاون کے لیے اس وقت تیار ہوں گے جب آپ کے ان سے مضبوط تعلقات ہوں گے۔ ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ وہ کون سی قوت ہے جس کے باعث انسانوں کے درمیان تعاون کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اس سوال کو ہم اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ عملی زندگی میں

دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان سب سے مضبوط binding force کون سی ہے!

انسانوں کے درمیان معاملات اعتبار اور بھروسے کی وجہ سے چلتے ہیں۔ان کی غیر موجودگی میں تمام رشتے بے روح ہو جائیں گے اور اپنی اصلیت کھو دیں گے۔رشتوں کے صرف نام باقی رہ جائیں گے۔ایسے کون سے اعمال ہیں‘ وہ کون سی عادات ہیں جو انسانوں کے درمیان بھروسے اور اعتماد کو ختم کرنے کا باعث بنتی ہیں؟ رسولِ اکرم ﷺ کے ارشاد کی روشنی میں وہ اعمال چار ہیں‘ جو منافق کی نشانیاں بھی ہیں۔ایک حدیثِ نبویؐ کے الفاظ ہیں:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ : إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(متفق علیہ)

’’منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے‘ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اُس کے پاس کوئی چیز بطور امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے۔‘‘

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ ’’مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب‘‘ میں علاماتِ نفاق کے حوالے سے فرماتے ہیں:

’’یہ مضمون ایک اور متفق علیہ حدیث میں اس سے بھی زیادہ تاکیدی اسلوب میں آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا)) کہ چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جس کسی میں وہ چاروں موجود ہوں تو وہ شخص پکا اور کٹر منافق ہے......اس حدیث میں تین باتوں کے علاوہ جن کا ذکر پچھلی حدیث میں تھا‘ چوتھی چیز آپ ﷺ نے یہ گنوائی: ((وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) کہ جب کہیں جھگڑا ہو تو وہ آپے سے باہر ہو جائے‘ نہ زبان پر کنٹرول رہے نہ جذبات پر۔یہ چوتھا وصف یا چوتھی علامت ہے منافق کی۔حضور ﷺ نے اس حدیث میں مزید وضاحت فرمائی کہ جس میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہیں وہ تو کٹر منافق ہے جبکہ جس میں ان میں سے کوئی ایک وصف پایا جاتا ہے اس میں اسی مناسبت سے نفاق موجود ہے۔‘‘(جلد دوم: ص ۲۰۰)

یہ چار نشانیاں بھروسے اور اعتماد کی قاتل ہیں‘ اس لیے ایک منافق شخص اسلامی معاشرے کے لیے نہایت خطرناک ہے۔

پہلی عادت

پہلا وصف یا عادت جس سے انسان کا بھروسا ختم ہوتا ہے اور جو اُس کی ترقی کی راہ میں

سب سے بڑی رکاوٹ ہے‘ جھوٹ بولنا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جب بات کرے جھوٹ بولے۔ جھوٹ تمام برائیوں کی ماں ہے۔ نبی اکرمﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ مجھے کوئی ایسی نصیحت کیجیے کہ مَیں برائیوں سے بچ جاؤں۔ آپﷺ نے فرمایا: ’’جھوٹ نہ بولو۔‘‘

جھوٹ کی ایک صفت یہ ہے کہ یہ انڈے بچے دیے بغیر نہیں رہتا۔ اس طرح یہ بڑی تیزی سے پھلتا پھولتا ہے اور فرد کی credibility کو کم کرتا جاتا ہے۔

دوسری عادت

دوسری عادت سے دنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی مشکوک ہو جاتی ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ یعنی ’’جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔‘‘

انسان کے بھروسے اور اعتبار کو ٹھیس پہنچانے والی دوسری بڑی چیز وعدہ خلافی ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں جو اچھی عادات تھیں اُن میں ایک وعدہ ایفا کرنا تھا۔ اسلام نے اس عمل کو دین کا حصہ بنا دیا اور اس حد تک نمایاں کیا کہ آپﷺ کے ارشاد کے مطابق جو مسلمان وعدے کی پابندی نہیں کرتا وہ اسی مناسبت سے منافق ہے۔ وہ معاشرے میں اپنا اعتبار کھو دیتا ہے۔

یہ ایک نہایت اہم بات ہے لیکن ہم میں سے اکثر اس کا شعور نہیں رکھتے اور اپنے وعدوں پر عمل درآمد نہ کرنے کو معمولی امر جانتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بنیادی انسانی اخلاقیات پر عمل کی ایک قیمت چکانی پڑتی ہے۔ مثلاً بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے سچ بولنے سے ہمیں نقصان ہوتا ہے یا وعدہ پورا کرنے سے کسی مشکل کا خدشہ ہوتا ہے۔ ہم یہ قیمت ادا کرنے پر تیار نہیں ہوتے‘ اس لیے جھوٹ بولتے ہیں‘ وعدہ خلافی کرتے ہیں یا خیانت کرتے ہیں۔

بنیادی انسانی اخلاقیات پر عمل نہ کرنے کے اثرات مسلم اور غیر مسلم دونوں پر یکساں ہوتے ہیں۔ غیر مسلم کی تو صرف ساکھ متاثر ہوتی ہے‘ مسلمان پر اس کے ساتھ منافق کا ٹھپا بھی لگ جاتا ہے۔

تیسری عادت

تیسرا عمل جو بھروسے اور اعتبار کو ختم کر کے کامیابی سے دور کرنے والا ہے‘ وہ ہے خیانت۔ آپﷺ نے فرمایا: وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ ’’جب کوئی چیز امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے۔‘‘

عام طور پر مال و اسباب کے لین دین میں کمی بیشی کو خیانت کہتے ہیں۔ تاہم اسلام میں خیانت کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ معاملات میں ہر طرح کا لین دین جس میں کمی بیشی یا دھوکے کا عنصر شامل ہو‘ اسے ہم خیانت کہہ سکتے ہیں۔

معاملات میں لین دین کی ابتدا گفتگو سے ہوتی ہے۔ بات چیت کے ذریعے ہم آپس میں خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ کچھ افکار ہم دوسروں کو دیتے ہیں اور کچھ خیالات ہم دوسروں سے لیتے ہیں۔ جانبین کی یہ گفتگو ایک دوسرے کے پاس امانت ہوتی ہے۔ اجازت کے بغیر اس گفتگو کو دوسروں تک پہنچانا خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ’’جب کوئی شخص کوئی بات کہے‘ پھر وہ چلا جائے تو اس کی بات امانت ہے۔‘‘ (جامع ترمذی‘ سنن ابوداؤد)

کئی دفعہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم جو گفتگو کر کے فارغ ہوئے ہیں وہ کسی کی امانت ہے۔ ہم اس میں خیانت کر دیتے ہیں‘ جس سے ہماری ساکھ متاثر ہوتی ہے۔

تعلقات خراب ہونے کی ایک وجہ

دوست احباب کے درمیان اور گھریلو رشتوں کے درمیان تعلقات عام طور پر گفتگو کی اسی خیانت کے باعث متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً بیوی نے کوئی بات خاوند سے کی‘ وہی بات خاوند نے اپنی والدہ تک پہنچا دی یا خاوند کے بھائی‘ بہنوں تک پہنچ گئی۔ اسی طرح خاوند نے کوئی بات بیوی سے کی اور بیوی نے اپنے بھائی‘ بہنوں تک پہنچا دی۔ دفتر میں ایک ساتھی نے دوسرے سے افسر کے متعلق کوئی بات کی‘ اگلے دن وہ بات افسر تک پہنچ گئی۔ زندگی میں یہ رویہ یا بے احتیاطی بھروسے اور رشتوں کی قاتل ہے۔

ہمارا پہلا تعارف ہماری زبان ہے۔ اسی سے ہم دوسروں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی سے ہم دوسروں کو اپنا ہم نوا بناتے ہیں۔ اگر ہم اپنی زبان کو ’’امین‘‘ نہیں بنا سکتے‘ تو اس کے دوسروں پر اثرات ہوں گے۔ ایسی صورتِ حال میں دوسرے کیسے ہم پر اعتبار کر سکتے ہیں؟

زبان کو ’’امین‘‘ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زبان سے جو بات نکلے وہ سچی ہو۔ ہماری زبان جو وعدہ کرے وہ پورا ہو۔ ہماری زبان سے جو بات ادا ہو وہ نرم انداز میں ہو۔ ایسی زبان پر کون اعتبار نہیں کرے گا اور کیوں نہیں کرے گا؟ ایسی زبان تو نایاب ہے‘ ہر کوئی اس

کا چاہنے والا ہے‘ سب اس کے متلاشی ہیں۔ جس کے پاس ایسی زبان ہو وہ تو مومن ہے۔ کامیابی کیوں نہ اس کے قدم چومے گی! ایسی زبان کو اللہ کی مدد کیوں نہ حاصل ہوگی!

چوتھی عادت

غصہ یا بدکلامی کرنے والے شخص کا بھرم قائم نہیں رہتا۔ یہ چیز دنیا اور آخرت میں خسارے کا باعث بنتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے منافق کی چوتھی نشانی یوں بیان فرمائی: ((وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) کہ جب کہیں جھگڑا ہو تو وہ آپے سے باہر ہو جائے۔

انسانوں کے باہمی معاملات میں سب سے کڑوی چیز غصہ یا بدکلامی ہے۔ اس کے اثرات تیزاب کی مانند ہوتے ہیں۔ غصہ برسوں کے تعلقات کو چند لمحوں میں خاک کر دیتا ہے۔ جو شخص غصہ ناک پر رکھ کر تعلقات بنانے چلا ہو‘ اس کی کامیابی کے امکانات نہایت کم ہوتے ہیں۔

ان چار اعمال کے اثرات انسان کی سیرت و کردار پر اتنے تباہ کن ہیں کہ ایک روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی آئے ہیں: ((وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ)) خواہ وہ شخص روزہ رکھتا ہو‘ نماز پڑھتا ہو اور اُسے یہ زعم ہو‘ وہ یہ خیال کرتا ہو کہ مَیں مسلمان ہوں‘ لیکن اگر یہ چاروں وصف اس میں موجود ہیں تو وہ پکا منافق ہے۔

نفاق کی اقسام

نفاق کی دو اقسام ہیں:

۱۔ <u>ایمان اور عقیدے کا نفاق:</u> یہ کفر کی بدترین قسم ہے۔ اس کی نشان دہی صرف وحی سے ممکن ہے۔

۲۔ <u>عملی نفاق:</u> جسے سیرت و کردار کا نفاق بھی کہتے ہیں۔

ان عادات کے باعث انسان دین سے دور تو ہوتا ہی ہے‘ اس کے ساتھ دنیا میں بھی اس فرد کی نیک نامی متاثر ہوتی ہے۔ ان معاملات کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ مجھے اور آپ کو اُس کے ان رویوں سے فرق پڑے گا۔ اس لیے اسلام نے ان رویوں کو اتنی اہمیت دی ہے۔

عبادات اور معاملات

معاشرے عبادات سے نہیں‘ معاملات سے چلتے ہیں۔ عبادات اپنی روح انسان کے

معاملات میں منتقل کرتی ہیں‘ جس سے معاملات میں خوب صورتی پیدا ہوتی ہے اور وہ بنیادی نظریے کے مطابق ڈھلتے ہیں۔ جس فرد یا معاشرے میں عبادات معاملات کو اپنی گرفت میں نہیں لیتیں یا معاملات پر اثر انداز نہیں ہوتیں وہاں معاملات‘ معاشرے میں منفی رویوں کو جنم دیتے ہیں۔ عبادات سمٹ کر مسجد یا گھر تک محدود ہو جاتی ہیں۔ فرد اور معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ عبادات اپنے اثرات کھو کر رسومات (rituals) میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ایسا معاشرہ جہاں منافقت کے ان چاروں اعمال پر عمل کیا جاتا ہو وہ خود تو بدنام ہوگا ہی‘ اس کے ساتھ جڑی نمازیں اور روزے بھی بدنام ہو جائیں گے۔

جس فرد میں منافقت کی یہ چاروں عادات پائی جاتی ہوں‘ اس کا مسلم معاشرے میں ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ مسلم معاشرہ تو دور کی بات‘ منافقت کی ان چار عادات کے ساتھ وہ کسی بھی اچھے معاشرے میں ترقی نہیں کر سکتا۔

موجودہ صورتِ حال

اس وقت معاشرے کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ اگر ترقی کرنی ہے تو منافقت کے ان اعمال (جھوٹ‘ وعدہ خلافی‘ خیانت‘ غصہ) کے بغیر ممکن نہیں۔ مادی طور پر کسی بلندی تک پہنچنے کے لیے یہ خصوصیات بطور آلات استعمال ہوتی ہیں۔ یہ کوئی تخیلاتی بات نہیں بلکہ ہر شخص اسے دیکھ سکتا ہے۔ ’’مسلم فرد‘‘ اچھے انسان سے اوپر کی چیز ہے۔ اچھا مسلمان بننے کے لیے پہلے اچھا انسان بننا ضروری ہے‘ اور اچھے انسان کے لیے ان چار عادات سے احتراز لازم ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

لوگ کہتے ہیں کہ معاشرے میں کامیابی کے لیے وعدہ خلافی بھی کرنی پڑتی ہے‘ خیانت اور جھوٹ بولنا بھی ضروری ہے۔ البتہ کوئی یہ نہیں کہتا کہ کامیابی کے لیے ’’غصہ یا بدزبانی‘‘ بھی ضروری ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ بدزبانی سے بزنس بھی خراب ہوگا‘ نوکری اور تعلقات بھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غصہ یا بدزبانی کا ردِعمل فوری ہوتا ہے۔ اس کے مقابل ہم وعدہ خلافی‘ خیانت اور جھوٹ پر فوری اور مؤثر ردِعمل نہیں دیتے۔ معاشرے نے ان برائیوں کو کافی حد تک قبول کر لیا ہے۔ ان میں ہم مصلحت سے کام لیتے ہیں۔ کارڈ پر لکھے وقت پر اگر کوئی شادی ہال

پہنچ جائے تو وہاں کوئی اور نہیں ہوتا۔

برائی کے حق میں معاشرے کی قوت

جب اکثریت کسی برائی کو قبول کر لیتی ہے تو معاشرے کی قوت اس برائی کے حق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر وہاں برائی کرنا آسان ہو جاتا ہے' اور اچھائی کرنا مشکل۔ برائی کا فائدہ ہوتا ہے' اچھائی سے نقصان ہوتا ہے۔ جب معاشرے کی قوت برائی کی پشت پر آ جائے تو پھر نتیجہ وہ نکلتا ہے جس کی طرف قرآن مجید میں یوں اشارہ کیا گیا:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾﴾

''اور ڈرو اس فتنے سے جو تم میں سے صرف گنہگاروں ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا' اور جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ معاشرہ اپنے منفی اعمال کے باعث برائی کے خلاف بحیثیت مجموعی فوراً ردِّعمل دینے کے قابل نہیں رہا۔ منافقت حریت فکر و عمل کے لیے دیمک کا کام کرتی ہے۔ ایسے منافق معاشرے میں نظریہ اپنا کردار ادا نہیں کر سکتا۔ اس گندے پانی میں نظریے کی مچھلی کا تیرنا ممکن نہیں۔

دعوتی سرگرمیاں: نظریاتی کارکنوں کا محاذِ جنگ

میں اور آپ تنظیم اسلامی کی صورت میں جو کام کر رہے ہیں' اُس کا مقصد کیا ہے؟ اس وقت معاشرے کی قوت برائی کے حق میں ہے' اس لیے برائی کرنا آسان اور نیکی کرنا مشکل ہے۔ تنظیم اسلامی کی جِدّو جُہد کا مقصد اس معاشرتی دباؤ کو نیکی کی پشت پر واپس لانا ہے۔ جب معاشرے کی قوت نیکی کی پشت پر آ جائے گی تو نیکی کرنا آسان اور گناہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ نیکی کا پورا اجر ملے گا اور معاشرے میں اس کے مثبت اثرات نظر آئیں گے۔ یہ کہنا تو آسان ہے لیکن عملاً ایسا کرنا ایک صبر آزما اور مشکل کام ہے۔ معاشرے کی اکثریت خاص کر مقتدر طبقات کے مفادات اس نظام سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان مفادات کی قربانی دینا ایک مشکل کام ہے۔

جب ہم دین کا کام کرتے ہیں تو دنیا ہاتھ سے جاتی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے

کے لیے نظریاتی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ معاشرے کے اس دباؤ کا مقابلہ نظریاتی طور پر مسلح افراد ہی کر سکتے ہیں۔ ہماری نظریاتی قوت کی بنیاد قرآن و سُنّت کی تعلیمات ہیں۔ معاشرے میں تبدیلی کے لیے پہلے اپنی ذات میں تبدیلی ضروری ہے۔ جب کوئی فرد تنظیم کی دعوتی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے تو یہ امر خود اس فرد میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ دعوتی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے بڑھ کر کوئی اور تربیت گاہ نہیں۔ انفرادی اور اجتماعی دعوتی سرگرمیاں نظریاتی کارکنوں کا میدانِ جنگ ہیں۔ اس سے بڑھ کر‘ نظریاتی کارکنوں کے کس بل نکالنے والا کوئی اور تربیتی پروگرام نہیں۔ اس سپاہی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جو سامنے موجود میدانِ جنگ ہی میں نہ جائے۔ دعوتی سرگرمیاں انسان میں اعتماد پیدا کرتی ہیں۔ اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہیں۔

کامیابی کی چار عادات یعنی سچائی پر کاربند رہنا‘ وعدہ کی پابندی‘ امانت و دیانت اور غصہ پر قابو پا نا مل کر کامیابی کی بنیاد بناتی ہیں۔ ان چاروں کے بغیر دینی اور دنیاوی کامیابیاں اپنا سفر شروع ہی نہیں کرسکتیں۔ اسی لیے ان چار اعمال پر عمل درآمد نہ کرنے والا فرد مسلم معاشرے کے لیے ناکارہ ہے اور اسے پکا منافق کہا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسے فرد کی ناکامی کی تصدیق اللہ کے رسول ﷺ نے خود فرمائی ہے۔

یہ چاروں عادات بھروسے اور اعتماد کی بنیاد ہیں۔ جب تک لوگ آپ پر اعتماد نہیں کریں گے‘ زندگی کے کسی نتیجے میں آپ کی کامیابی ممکن نہیں۔ اعتماد اور بھروسا ہی زندگی میں آگے بڑھنے کی کلید ہے۔ اور یہی چار عادات اس چابی کے چار دانتے (کونے) ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری چابی کامیابی کا تالا کیوں نہیں کھولتی؟ وہ اس لیے نہیں کھولتی کہ ہماری چابی کے دانتے پورے نہیں۔ کسی کی چابی کے دو ہیں‘ کسی کے تین دانتے ہیں۔ اگر پورے ہیں تو وہ تیز (sharp) نہیں۔ کامیابی کے لیے چاروں دانتے sharp حالت میں ہونے چاہئیں۔ براہ مہربانی اپنی کامیابی کے چاروں دانتوں کو تیز کیجیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان غلط نہیں ہوسکتا!

❁❁❁

حصولِ علم کا ذریعہ: مطالعہ

احمد علی محمودی

☆ مطالعہ کی تعریف

مطالعہ سے مراد کسی چیز کو غور وفکر‘ توجہ اور سمجھ بوجھ کے ساتھ پڑھنا ہے تاکہ علم حاصل کیا جاسکے‘ فہم میں اضافہ ہو اور انسان کی سوچ و کردار میں بہتری آئے۔ مطالعہ صرف الفاظ کو دیکھنے کا نام نہیں‘ بلکہ اس کے مفہوم کو سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کا نام ہے۔ سادہ الفاظ میں مطالعہ وہ عمل ہے جس میں ہم کتابوں‘ مضامین یا کسی بھی تحریری مواد کو اس نیت سے پڑھتے ہیں کہ ہمیں کچھ نیا سیکھنے اور سمجھنے کو ملے۔

☆ انسان اور علم

علم اور انسان کا رشتہ فطری‘ لازمی اور ابدی ہے۔ علم وہ روشنی ہے جو انسان کو اندھیروں سے نکال کر شعور‘ بصیرت اور ہدایت کی طرف لے جاتی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے‘ اور اس کی یہ برتری صرف عقل و شعور کی بنیاد پر ہے۔ اگر انسان کے پاس علم نہ ہو تو وہ اپنی عقل کا صحیح استعمال بھی نہیں کرسکتا۔ علم انسان کو نہ صرف دنیا کے مسائل سمجھنے کی صلاحیت دیتا ہے‘ بلکہ اُسے اپنے خالق کی معرفت بھی عطا کرتا ہے۔ ایک جاہل انسان اندھی تقلید میں زندگی گزارتا ہے‘ جبکہ ایک صاحبِ علم اپنی زندگی کو کسی مقصد‘ فہم اور حکمت کے ساتھ گزارتا ہے۔ علم انسان کی روحانی‘ اخلاقی اور معاشرتی ترقی کا ذریعہ ہے۔ یہی علم انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے اور اُسے اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔ انسان علم کے بغیر اندھیرے میں بھٹکتا رہتا ہے۔ لہٰذا ایک کامیاب‘ باوقار اور بااخلاق انسان بننے کے لیے علم حاصل کرنا اور اس علم کے تقاضوں کو پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔

مطالعہ ایک مفید عادت ہے جو انسان کی شخصیت‘ سوچ‘ فہم‘ اور کردار سازی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مطالعہ فرد کو نہ صرف تعلیمی میدان میں ترقی دیتا ہے‘ بلکہ اسے اخلاقی‘ ذہنی

اور معاشرتی طور پر بھی مضبوط بناتا ہے۔ مطالعے سے دوری جہالت اور پس ماندگی کا سبب بنتی ہے۔

☆مطالعہ کی اہمیت: اسلامی تناظر میں

اسلام ایک ایسا دین ہے جو علم، فہم، تحقیق اور غور و فکر کو بہت بلند مقام دیتا ہے۔ اس حوالے سے ذیل میں مطالعہ کی اہمیت مختلف پہلوؤں سے بیان کی گئی ہے:

(۱) قرآن کا پہلا حکم ''اِقْرَاْ'' (پڑھ) ہے۔ اسلام میں علم حاصل کرنے کی بنیاد ہی پڑھنے پر رکھی گئی ہے۔ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ①﴾ (العلق) ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔'' پہلی وحی یہ ثابت کرتی ہے کہ اسلام علم اور مطالعہ کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔

(۲) علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ)) (سنن ابن ماجه)

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے۔''

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطالعہ اور علم کا حصول ایک دینی ذمہ داری ہے، نہ کہ صرف دنیاوی فائدہ۔

(۳) علم انسان کو حق و باطل میں فرق کرنا سکھاتا ہے۔ مطالعہ سے انسان کو اللہ کی معرفت، شریعت کی سمجھ، اور زندگی کے مسائل کا اسلامی حل جاننے میں مدد ملتی ہے۔ علم کی روشنی میں انسان گمراہی سے بچ سکتا ہے۔

(۴) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن و حدیث کے علم کو حاصل کرنے کے لیے سفر کرتے تھے، راتوں کو جاگتے تھے، اور صرف اللہ کی رضا کے لیے مطالعہ و تعلیم کا اہتمام کرتے تھے۔

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ﴾ (المجادلة:۱۱)

''اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں اور علم والوں کے درجات بلند فرمائے گا۔''

اسلامی تناظر میں مطالعہ نہ صرف دینی فریضہ ہے، بلکہ یہ انسان کی دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کی کنجی ہے۔ قرآن، حدیث، سیرت، فقہ اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ ہر مسلمان کو کرنا چاہیے تاکہ وہ ایک باشعور، نیک، اور باعمل مسلمان بن سکے۔

☆ مطالعہ کے فوائد

(۱) علم میں اضافہ: مطالعہ ایک چراغ کی مانند ہے جو جہالت کی تاریکی کو علم کی روشنی سے بدل دیتا ہے۔ علم کا حصول تب ہی ممکن ہے جب مطالعہ کو مستقل عادت بنالیا جائے۔ مطالعے کے ذریعے انسان نئے علوم وفنون سیکھتا ہے۔ مختلف موضوعات پر مطالعہ انسان کو دنیا کی حقیقتوں‘ تاریخ‘ دین اور سائنسی معلومات سے روشناس کرواتا ہے۔ مطالعہ انسان کو بصیرت اور فہم عطا کرتا ہے۔ انسان کی فکری‘ علمی اور روحانی ترقی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ یہ نہ صرف علم میں اضافہ کرتا ہے بلکہ سوچنے‘ سمجھنے اور فیصلے کرنے کی صلاحیت کو بھی نکھارتا ہے۔ جو قومیں مطالعہ کو اپنا معمول بناتی ہیں‘ وہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہوتی ہیں۔ مطالعہ کے ذریعے انسان نئے خیالات‘ تجربات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہوتا ہے۔ روزانہ مطالعہ کرنے کی عادت ہمیں وقت کی قدر سکھاتی ہے‘ تعمیری اور مثبت سوچ عطا کرتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ روزانہ کچھ وقت مطالعہ کے لیے ضرور مخصوص کریں۔

(۲) سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت: مطالعہ انسان کے ذہن کو جلا بخشتا ہے اور اُس کی فکری صلاحیتوں کو نکھارتا ہے۔ انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ ایک مسئلے کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے کیسے دیکھا جاسکتا ہے! اس سے قوتِ مشاہدہ‘ تجزیہ کرنے کی صلاحیت اور منطقی استدلال پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص مطالعہ کرتا ہے‘ تو وہ صرف معلومات حاصل نہیں کرتا‘ بلکہ مختلف زاویوں سے سوچنے اور سمجھنے کا عادی ہوجاتا ہے۔ مطالعہ ذہن کو نئے خیالات‘ تصورات اور مسائل کا سامنا کرنے کی تربیت دیتا ہے۔ منطقی انداز میں مسائل کو حل کرنے کی مہارت سکھاتا ہے‘ جس سے تنقیدی سوچ (critical thinking) پیدا ہوتی ہے۔ ادبی مطالعہ جذبات واحساسات کو سمجھنے کی صلاحیت کو بہتر بناتا ہے۔ مطالعہ صرف وقت گزارنے کا ذریعہ نہیں‘ بلکہ ایک ذہنی مشق ہے جو انسان کے سوچنے‘ سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں کو جلا دیتی ہے۔

(۳) شخصیت کی تعمیر: مطالعہ شخصیت سازی کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اچھی کُتب ولٹریچر سے انسان میں صبر وتحمل‘ الفت ومحبت‘ عدل وانصاف‘ دیانت وامانت‘ اور اخلاص جیسی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مطالعہ انسانی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ایک باشعور‘ مہذّب اور بااخلاق انسان کی تشکیل مطالعہ سے ہی ممکن ہے۔ مطالعہ نہ صرف علم میں اضافہ کرتا ہے‘ بلکہ

انسان کی سوچ‘ طرزِ گفتگو‘ اندازِ فکر اور کردار کو بھی سنوارتا ہے۔

(۴) وقت کا مفید مصرف: مطالعہ انسان کی فکری‘ اخلاقی اور علمی ترقی کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ فارغ اوقات کو مفید بنانے کے لیے مطالعہ بہترین سرگرمی ہے جو انسان کو بے راہ روی سے بچاتی ہے۔ ایک باشعور انسان جانتا ہے کہ وقت ایک قیمتی سرمایہ ہے اور مطالعہ اس سرمائے کا بہترین استعمال۔ مطالعے سے انسان کے علم میں وسعت اور شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ چاہے دینی کتب ہوں یا دنیاوی‘ ہر قسم کا مطالعہ انسان کی ذہنی بالیدگی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مطالعہ انسان کو وقت کی قدر کرنا سکھاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ فارغ وقت کو ضائع کرنے کے بجائے مطالعے کو اپنی زندگی کا معمول بنائیں۔

(۵) زبان و بیان میں بہتری: مطالعہ انسان کی فکری و لسانی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب ہم مختلف موضوعات پر کتابیں‘ اخبارات‘ مضامین اور ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری زبان میں نکھار آتا ہے‘ الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا ہے اور جملے بنانے کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے۔ ادبی کتب کا مطالعہ خاص طور پر زبان و بیان کی اصلاح میں مددگار ثابت ہوتا ہے‘ کیونکہ ان میں اعلیٰ معیار کی تحریر‘ خوبصورت اسلوب اور مؤثر اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔ مطالعہ نہ صرف نئے الفاظ سے روشناس کراتا ہے‘ بلکہ ان کے درست استعمال کا طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ اس کے علاوہ‘ مطالعہ سے انسان کی سوچ میں گہرائی اور بیان میں روانی آتی ہے۔ مطالعہ زبان و بیان کو سنوارنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے جو ہر طالبِ علم اور لکھاری کے لیے ضروری ہے۔

(۶) خوداعتمادی میں اضافہ: مطالعہ انسان کی شخصیت نکھارنے اور اُس کی فکری و ذہنی نشوونما کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ جب انسان باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہے تو اُسے علم میں وسعت حاصل ہوتی ہے‘ جس سے اُس کی سوچ میں گہرائی آتی ہے۔ یہ انسان کو پُراعتماد بناتا ہے‘ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ کس موضوع پر کیا بات کر رہا ہے!

(۷) روحانی و ذہنی سکون: مطالعہ روح اور ذہن کو سکون فراہم کرنے کا بھی ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ جب انسان کسی اچھی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے‘ تو وہ دنیاوی اُلجھنوں سے ہٹ کر ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے‘ جہاں فکر و فہم کی روشنی اُسے اندرونی سکون عطا کرتی ہے۔ مطالعہ ذہنی تناؤ کو کم کرتا ہے‘ خیالات کو منظم کرتا ہے اور انسان کی سوچ کو مثبت بناتا ہے۔ دینی و اخلاقی

کتب کا مطالعہ انسان کو روحانی سکون فراہم کرتا ہے اور اُسے اللہ سے قربت کا احساس دلاتا ہے۔ مطالعہ انسان کے اندر صبر‘ شکر‘ قناعت اور سچائی جیسے اوصاف پیدا کرتا ہے‘ جو روحانی بالیدگی کے لیے لازمی ہیں۔

☆ مطالعہ کی عادت: چند عملی طریقے

(۱) سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضا اور علم حاصل کرنے کی خالص نیت کریں۔ جب نیت اچھی ہو تو کام میں برکت ہوتی ہے۔

(۲) ایک مخصوص وقت مطالعے کے لیے مقرر کریں۔ مستقل وقت عادت بنانے میں بہت مدد دیتا ہے۔

(۳) چھوٹی شروعات کریں۔ شروع میں ۱۰ سے ۱۵ منٹ روزانہ پڑھنا شروع کریں۔ آہستہ آہستہ وقت بڑھاتے جائیں۔

(۴) دلچسپی کے موضوعات سے آغاز کریں۔ وہ کتابیں یا موضوعات منتخب کریں جن میں آپ کو دلچسپی ہو۔

(۵) کتاب ہمیشہ ساتھ رکھیں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو (جیسے سفر میں یا انتظار کے دوران)‘ تو اسے مطالعے میں استعمال کریں۔ اس مقصد کے لیے چھوٹی کتاب یا موبائل میں پی ڈی ایف رکھنا مفید ہے۔

(۶) روزانہ یا ہفتے کا ایک ہدف بنائیں‘ مثلاً: ’’میں روزانہ پانچ صفحات پڑھوں گا یا اس ہفتے یہ کتاب مکمل کروں گا۔‘‘

(۷) مطالعے کو دوسروں سے شیئر کریں۔ جو کچھ پڑھیں اُسے گھر والوں یا دوستوں کو مختصر انداز میں بیان کریں۔

(۸) مطالعے میں دلچسپی‘ سمجھ اور عمل کی توفیق کے لیے دعا کرتے رہیں۔ ’’رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا‘‘ (اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔)

☆ مطالعہ کے ذرائع

مطالعہ کے ذرائع وہ وسائل اور طریقے ہیں جن کی مدد سے ہم علم حاصل کرتے ہیں یا کسی

موضوع کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) طبع شدہ مواد: نصابی کتب، حوالہ جاتی کتب جیسے کہ لغات، انسائیکلوپیڈیا، ادبی کتب، رسالے اور اخبارات

(۲) ڈیجیٹل ذرائع: ای بکس، دستاویزی فلمیں، تعلیمی ویب سائٹس، آن لائن جرائد اور بلاگز

(۳) سمعی و بصری ذرائع: لیکچرز، ریڈیو پروگرامز، ٹی وی تعلیمی پروگرامز، پوڈ کاسٹس

(۴) تحقیقی ذرائع: تحقیقی مقالے، سروے رپورٹس

(۵) تجرباتی ذرائع: مطالعہ کے گروپس اور مباحثے، اساتذہ وعلماء سے ملاقات اور سوالات، ورکشاپس اور سیمینارز، فیلڈ ورک یا مشاہدہ

☆ مطالعہ کے آداب

(۱) ایسی جگہ کا انتخاب کریں جو پُرسکون، صاف ستھری اور بخوبی روشن ہو۔

(۲) مطالعہ منظم طریقے سے کریں، جیسے کہ پہلے آسان کتابیں، پھر مشکل، تاکہ تسلسل برقرار رہے۔

(۳) اہم نکات، اقوال، آیات یا حوالہ جات کو نوٹ کرنے کی عادت بنائیں۔

(۴) دینی کتب کو ادب واحترام سے پڑھیں، مناسب جگہ پر رکھیں۔ دورانِ مطالعہ غیر ضروری بات چیت، موبائل کے استعمال یا ہنسی مذاق سے پرہیز کریں۔

(۵) مطالعہ صرف معلومات حاصل کرنے کے لیے نہ ہو، بلکہ نیت یہ ہو کہ اس پر عمل کیا جائے گا۔

(۶) جو بات سمجھ نہ آئے، اُسے بار بار پڑھیں اور غور وفکر کریں۔ کسی عالم یا استاد سے رہنمائی لینے میں بھی ہچکچاہٹ نہ ہو۔

(۷) مطالعہ سے پہلے اور بعد میں اللہ سے علم نافع (فائدہ مند علم) کی دعا مانگیں: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ ''اے اللہ! میں تجھ سے نفع دینے والا علم مانگتا ہوں، اور ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے۔'' ❁❁❁

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

بدگمانی اور تجسّس

حافظ محمد اسد ☆

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ جب انسان کو اپنے سے زیادہ دوسرے لوگوں کے ’’عیب و ہنر‘‘ کی فکر دامن گیر ہونے لگے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس شخص نے اپنی صلاحیتوں کو غلط سمت میں لگا کر اپنی اخلاقی تباہی کی طرف قدم بڑھا لیا ہے۔ اس روحانی بیماری کا آغاز بدگمانی سے ہوتا ہے۔ جب بدگمانیاں ہوں گی تو غیبت اور حسد جیسے مہلک امراض پیدا ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ بدگمانی کے حرام ہونے کی صورت کیا ہے؟

شارح بخاری علامہ بدرُ الدین عینیؒ فرماتے ہیں:

’’گمان وہ حرام ہے جس پر گمان کرنے والا مُصِر ہو (یعنی اصرار کرے) اور اسے اپنے دِل پر جما لے۔ وہ گمان جو دِل میں آئے اور قرار نہ پکڑے وہ مذموم نہیں۔‘‘ بحوالہ (عمدۃ القاری، ج ۱۵، ص ۲۱۸، تحت الحدیث: ۶۰۶۵)

آج المیہ یہ ہے کہ بدگمانی اور تجسّس کو ہم نے گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے، حالانکہ قرآن کریم کی نص سے ثابت ہے کے بدگمانی کرنا بھی گناہ ہے اور کسی کی ٹوہ لگانا بھی حرام ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۃ الحجرات کے دوسرے رکوع میں جن معاشرتی برائیوں کا ذکر کیا ہے ان میں بدگمانی اور تجسّس کو بایں طور بیان فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾﴾

’’اے ایمان والو! بہت گمانوں سے بچو، بے شک کوئی گمان گناہ ہو جاتا ہے اور عیب نہ ڈھونڈو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی پسند رکھے گا کہ اپنے مرے

☆ استاذ، قرآن اکیڈمی یٰسین آباد، کراچی

ہوئے بھائی کا گوشت کھائے‘ تو یہ تمہیں گوارا نہ ہوگا۔اور اللہ سے ڈرو‘ بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والامہربان ہے۔‘‘

آیت کے پہلے حصے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو بہت زیادہ گمان کرنے سے منع فرمایا‘ کیونکہ بعض گمان ایسے ہیں جو محض گناہ ہیں۔لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ گمان کی کثرت سے بچا جائے۔(ابن کثیر‘الحجرات‘ تحت الآیۃ: ۱۲‘ ۷/۳۵۲)

ہمارے معاشرے میں بدگمانی کا مرض عام ہے۔موجودہ دور میں جب کسی شخص کو موبائل پر فون کیا جاتا ہےاور وہ نہ اٹھائے تو سب سے پہلے یہی گمان کیا جاتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر نہیں اٹھایا یا وہ بات نہیں کرنا چاہتا۔فون کرنے والا ایسی یقینی کیفیت میں مسلسل اس شخص کی برائیاں دل ہی دل میں کرتا رہتا ہے‘اور گناہوں کا بوجھ سمیٹتا رہتا ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہےاور وہ شخص کسی مجبوری کی وجہ سے فون نہیں اٹھاتا۔

اسی طرح کسی کا خط اس کی بغیر اجازت دیکھنا بھی جائز نہیں۔فی زمانہ خط وکتابت کا نظام چونکہ بدل چکا ہے اس لیے اس کا اطلاق موبائل پیغامات اور ای میل وغیرہ پر بھی ہوگا۔اس حوالے سے بھی ہمارے ہاں بڑی کوتاہی پائی جاتی ہے۔خاص طور پر میاں بیوی کے اکثر جھگڑوں کا سبب اسی موبائل کی بے احتیاطی کا نتیجہ ہوتا ہے۔حدیث مبارکہ میں اس بارے میں سخت وعید ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ نَظَرَ فِيْ كِتَابِ اَخِيْهِ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ فَاِنَّمَا يَنْظُرُ فِي النَّارِ))

(سنن ابی داؤد:۱۴۸۵)

’’جس کسی نے اپنے بھائی کا خط اس کی اجازت کے بغیر دیکھا (یعنی پڑھا) تو گویا وہ جہنم دیکھ رہا ہے۔‘‘

اس روایت کی رو سے فی زمانہ اس معاملے میں احتیاط بے حد ضروری ہے۔برے گمان سے بچنا ایک صاحبِ فہم انسان کا وتیرہ ہونا چاہیے۔

اچھے گمان کی عادت ڈالیے

دوسرے سے اچھا گمان کرنا چاہیے‘اس طرح انسان کئی گناہوں سے بچ جاتا ہے۔برا گمان جو غیر ارادی طور پر دل میں آجائے وہ مذموم نہیں ہے‘البتہ اس گمان کو جما لینا اور سوچ میں

پڑ جانا برا ہے۔ اِمام محمد غزالیؒ فرماتے ہیں:

''بدگمانی کے پختہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ مظنون کے بارے میں تمہاری قلبی کیفیت تبدیل ہو جائے، تمہیں اُس سے نفرت محسوس ہونے لگے، تم اُس کو بوجھ سمجھو، اس کی عزت و اِکرام اور اس کے لیے فکرمند ہونے کے بارے میں سستی کرنے لگو۔'' (بحوالہ احیاء العلوم، کتاب آفات اللسان، ج ۳، ص ۱۸۶)

اچھا گمان یہ ہے کہ ایک آدمی اگر رمضان المبارک کے موقع پر دن کے اوقات میں کسی ہوٹل سے نکل رہا ہے تو وسوسہ آئے گا کہ یہ روزہ دار نہیں ہے، لیکن فوراً خیال کرے کہ کسی بیمار کے لیے کھانا لینے آیا ہوگا یا افطار کے لیے پہلے سے لے کر جا رہا ہے وغیرہ۔ اسی طرح کسی نے فون نہیں اٹھایا تو سوچے کہ مصروف ہوگا اور اس شخص کے لیے خیر کی تمنّا کرے۔ حدیث مبارکہ میں اچھے گمان کو ''حسنِ عبادت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَةِ)) (سنن ابی داؤد: ۴۹۹۳)

''اچھا گمان رکھنا حسنِ عبادت میں سے ہے۔''

گویا اچھا گمان کرنا عبادت میں شامل ہوا۔ جب برا گمان اور تجسّس خرابیاں بھی پیدا کر رہا ہے اور نصِ قرآنی سے اس کا حرام ہونا بھی ثابت ہو گیا تو اب اچھا گمان کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟ حکماء فرماتے ہیں اس کا سبب ''تکبر'' کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا علاج بھی لازمی ہے۔

اپنے عیوب کی فکر کیجیے

انسان کو اگر اپنے عیوب کی فکر دامن گیر ہو جائے اور وہ اپنے انجام کی فکر میں لگ جائے کہ میرا رب مجھ سے ناراض نہ ہو، جہنم کی آگ سے بچنے کی فکر ہو تو پھر کسی کے عیب پر نگاہ نہیں جائے گی۔ بہادر شاہ ظفر فرماتے ہیں:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا!

بدگمانی سے بچنے کی تدابیر

(۱) کسی کی خامیوں کو ٹٹولنے اور اس کی ٹوہ میں رہنے کے بجائے اس کی خوبیوں پر نظر رکھنی

چاہیے۔ جو دوسروں کے متعلق حسنِ ظن رکھتا ہے اُس کے دل میں راحتوں کا بسیرا ہوتا ہے جبکہ جس پر شیطان کا ہتھیار کام کر جائے وہ بدگمانی کی بُری عادت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اُس کے دل میں وحشتوں کا ڈیرا ہوتا ہے۔

(۲) جب بھی کسی کے بارے میں دِل میں برا گمان آئے تو اسے جھٹک دیجیے اور اس کے عمل پر اچھا گمان قائم کرنے کی کوشش فرمایئے۔

(۳) خود نیک بنیے تا کہ دوسرے بھی نیک نظر آئیں۔ عربی مقولہ ہے: اِذَا سَاءَ فِعْلُ الْمَرْءِ سَاءَتْ ظُنُوْنُہ یعنی جب کسی کے کام برے ہو جائیں تو اُس کے گمان (یعنی خیالات) بھی برے ہو جاتے ہیں۔ اپنی اِصلاح کی کوشش جاری رکھیے کیونکہ جو خود نیک ہو وہ دوسروں کے بارے میں بھی نیک گمان (یعنی اچھے خیالات) رکھتا ہے۔

(۴) بری صحبت سے بچتے ہوئے نیک صحبت اِختیار کیجیے۔ جہاں دوسری برکتیں ملیں گی وہیں بدگمانی سے بچنے میں بھی مدد حاصل ہو گی۔ حضرت بشر بن حارثؒ فرماتے ہیں: صُحْبَۃُ الْاَشْرَارِ تُوْرِثُ سُوْءَ الظَّنِّ بِالْاَخْیَارِ یعنی بروں کی صحبت اچھوں سے بدگمانی پیدا کرتی ہے۔ (بحوالہ رسالہ قشیریۃ، باب الصحبۃ، ص ۳۲۸)

(۵) جب بھی دِل میں کسی کے بارے میں بدگمانی پیدا ہو تو خود کو بدگمانی کے انجام اور عذابِ الٰہی سے ڈرایئے۔

(۶) کسی کے لیے دِل میں بدگمانی آئے تو اُس کے لیے دُعائے خیر کیجیے اور اُس کی عزّت واِکرام میں اضافہ کر دیجیے۔

(۷) جب بھی کسی کے بارے میں ''بدگمانی'' ہونے لگے تو اپنے رب کریم کی بارگاہ میں یوں دُعا مانگیے: ''یاربّ! تیرا یہ کمزور بندہ دُنیا و آخرت کی تباہی سے بچنے کے لیے اِس بدگمانی سے اپنے دِل کو بچانا چاہتا ہے۔ یااللہ! مجھے شیطان کے خطرناک ہتھیار ''بدگمانی'' سے بچا لے۔ مجھے ''حسنِ ظن'' جیسی عظیم دولت عطا فرما دے۔''

دُعا ہے کہ ہمیں خوفِ خدا سے معمور دِل، رونے والی آنکھ اور لرزنے والا بدن عطا ہو۔

آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی
عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم رضؓ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مناقب اور آپ کی مظلومانہ
شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہدِ صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا' آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا تھا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانیؓ ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں۔
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے

بانی تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجئے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
اشاعت خاص :240 روپے اشاعت عام :145 روپے
(علاوہ ڈاک خرچ)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون :3-35869501
email:maktaba@tanzeem.org

July 2025
Vol.74

Regd. CPL No.115
No.7

Monthly **Meesaq** Lahore